فروغ فرخ زاد اور کشور ناہید کا نسائی تصور

(تقابلی مطالعہ)

مقالہ برائے ایم۔فل (اردو)

مقالہ نگار:

روشین عاقب

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

ستمبر ۲۰۱۸ء

فروغ فرخ زاد اور کشور ناہید کا نسائی تصور

(تقابلی مطالعہ)

مقالہ نگار:

روشین عاقب

یہ مقالہ

ایم۔فل (اردو)

کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا گیا۔

فیکلٹی آف لینگویجز

(اردو زبان و ادب)

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

ستمبر ۲۰۱۸ء

مقالے کا دفاع اور منظوری کا فارم

زیر دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ انہوں نے مندرجہ ذیل مقالہ پڑھا اور مقالے کے دفاع کو جانچا ہے۔ وہ مجموعی طور پر امتحانی کارکردگی سے مطمئن ہیں اور فیکلٹی آف لینگویجز کو اس مقالے کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: **فروغ فرخ زاد اور کشور ناہید کا نسائی تصور** (تقابلی مطالعہ)

پیش کار: روشین عاقب رجسٹریشن نمبر: 1104-MPhil/urdu/F15

ماسٹر آف فلاسفی

شعبہ: زبان و ادب اردو

ڈاکٹر روبینہ شہناز _____

نگران مقالہ

پروفیسر ڈاکٹر محمد سفیر اعوان _____

ڈین فیکلٹی آف لینگویجز

بریگیڈیئر محمد ابراہیم _____

ڈائریکٹر جنرل

_____

تاریخ

اقرار نامہ

میں، روشین عاقب حلفیہ بیان کرتی ہوں کہ اس مقالے میں پیش کیا گیا کام میرا ذاتی ہے اور نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز اسلام آباد کے ایم فل سکالر کی حیثیت سے ڈاکٹر روبینہ شہناز کی نگرانی میں کیا گیا ہے۔ میں نے یہ کام کسی اور یونیورسٹی یا ادارے میں ڈگری کے حصول کے لیے پیش نہیں کیا اور نہ آئندہ کروں گی۔

_____

روشین عاقب

مقالہ نگار

فہرست ابواب

مقالہ اور دفاع مقالہ کی منظوری کا فارم		III
اقرار نامہ		IV
فہرستِ ابواب		V
مقالے کا دائرہ کار		VII
Abstract		IX
مقالے کا مقصد		X
اظہار تشکر		XI
باب اوّل:	تقابل اور تانیثیت: بنیادی مباحث	۱
	الف) تقابلی مطالعہ کیا ہے	۱
	ب) فیمینزم۔ تعارف	۷
	i۔ تانیثیت۔ روایت	۱۱
	ii۔ مغرب میں تانیثیت	۲۳
	iii۔ برصغیر میں تانیثیت	۲۹
	iv۔ اُردو شعر و ادب میں تانیثت	۳۷
	v۔ ایرانی فیمینزم	۴۶
	ج) فروغ فرخ زاد اور کشور ناہید کا مختصر تعارف	۵۲
۔	حوالہ جات	۵۶

باب دوم:	کشور ناہید اور فروغ زاد کی شاعری کا جائزہ (سیاسی و سماجی مسائل کے تناظر میں)	۶۱
	الف) کشور ناہید اور ان کی شاعری	۶۱
	ب) فروغ فرخ زاد اور ان کی شاعری	۹۴
	۔ حوالہ جات	۱۱۵
باب سوم:	کشور ناہید اور فروغ فرخ زاد کی شاعری کا جائزہ (نفسیاتی و جنسی تناظر میں)	۱۱۹
	الف) کشور ناہید اور ان کی شاعری	۱۱۹
	ب) فروغ فرخ زاد اور ان کی شاعری	۱۴۹
	۔ حوالہ جات	۱۶۷
باب چہارم:	فروغ فرخ زاد اور کشور ناہید کی شاعری: تقابلی جائزہ	۱۷۱
	۔ حوالہ جات	۲۳۴
باب پنجم:	الف) مجموعی جائزہ	۲۳۷
	ب) نتائج	۲۴۷
	ج) سفارشات	۲۴۹
	۔ کتابیات	۲۵۰

مقالے کا دائرہ کار

میں نے اپنی تحقیق بعنوان "فروغ فرخ زاد اور کشور ناہید کا نسائی تصور (تقابلی مطالعہ)" کے لیے دونوں شاعرات کا شاعری کا میدان منتخب کیا ہے اور اس کے لیے مقالے کو پانچ ابواب میں منقسم کیا ہے۔

جن کی تفصیل درج ذیل ہے:

پہلے باب میں تقابلی جائزے کے حوالے سے تقابل کا مفہوم، روایت اور طریقہ کار بیان کیا گیا ہے۔ اس تحقیق کی بنیاد چونکہ نسائی تصور ہے اس لیے تانیثیت یا فیمینزم کا مفہوم اور تعریف بیان کی گئی ہے۔ یورپ میں اس تحریک کا آغاز اور ہندوستان اور ایران میں اس کے اثرات پر بحث کی گئی ہے۔ فروغ فرخ زاد اور کشور ناہید کا مختصر تعارف پیش کیا گیا ہے۔

دوسرے باب کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصے میں کشور ناہید کے حالاتِ زندگی اور خواتین کے حوالے سے سیاسی اور سماجی مسائل پر ان کی گہری نظر اور شاعری کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ دوسرے حصے میں فروغ فرخ زاد کے احوال و آثار اور ایرانی معاشرے میں عورت کے عمومی تصور اور مقام پر ان کے تصورات اور شاعری کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

تیسرے باب کو بھی دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصے میں عورت کے جذبات، احساسات اور نفسیات کے حوالے سے کشور کے نسائی تصور اور شاعری میں اس کے اظہار کا جائزہ لیا گیا ہے۔ دوسرے حصے میں فروغ فرخ زاد کے ہاں نفسیاتی اور جنسی حوالے سے تصورات اور بے باک اظہار کی مختلف صورتوں کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

چوتھے باب میں تقابل کے طریقے اور روایت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے فروغ فرخ زاد اور کشور ناہید کے شعری مجموعوں کا تقابلی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اس کے لیے فروغ فرخ زاد کے پانچ شعری مجموعے اور کشور ناہید کے آٹھ شعری مجموعے جو ان کی کلیات "دشت قیس میں لیلیٰ" میں شامل ہیں، پر بحث کی گئی ہے۔ اس تقابل

کے لیے کچھ معیارات مقرر کیے گئے ہیں۔ مختلف تصورات کو واضح کرنے کے لیے ان کا پس منظر بیان کیا گیا ہے۔ موضوعات کا انتخاب اور ان کی پیشکش کے حوالے سے اشتراکات اور افتراقات کو سامنے لایا گیا ہے اور ان کی توجیحات بیان کی گئی ہیں۔

پانچویں باب میں تحقیق کا مکمل نچوڑ پیش کیا گیا ہے۔ اس میں مجموعی جائزہ کے تحت گزشتہ تحقیق کا جائزہ پیش کیا گیا ہے اور ایک جیسی سوچ رکھنے والی دو مختلف ثقافتوں کی خواتین کے تانیثی شعور میں موجود مشترکات اور اختلافات کے محرکات کی نشاندہی کی گئی ہے۔ اس تمام تر تحقیق سے جو نتائج سامنے آئے ہیں اُن کو "نتائج" کے تحت درج کر دیا گیا ہے۔ جبکہ تمام تر تحقیق کو مد نظر رکھتے ہوئے سفارشات بھی پیش کی گئی ہیں۔

Abstract

This research thesis is titled “Farogh Farokhzad and Kishwer Naheed’s Ideology of Feminism”: Comparative Analysis. The purpose of this research is to analyze the present feminine ideology in Farogh, Farukhzad and Kishwer Naheed’s poetry to elucidate the perception of feminism, under which most of their literary compilation is present.

This thesis first and foremost focuses on the inferences and methods of comparison. Since the foundation of this thesis is the ideology of feminism that is why feminism’s inferences, traditions and its global influence have also been debated.

Furthermore, to clarify Farogh Farukhzad’s and Kishwer Naheed’s Ideology of Feminism, some standards have been set; in terms of sociopolitical, psychological and sexual; the various ways of expressions, have also been observed.

For this thesis poetic work of both the poets have been selected; out of which eight books by Kishwer Naheed and five books by Farogh Farukhzad have been chosen. To define various different perceptions, their backgrounds have been thoroughly explained. The selection and presentation of the topics have been defined on the basis of their similarities and differences. Two women with two completely different backgrounds having in-depth knowledge and comprehension of feminism and the ways and the extent to which and how they’ve explained their understanding of feminism on what standards. In short, the overview of their feminist values and the similarities and differences among them have been thoroughly discussed.

مقالہ کا مقصد

یہ تحقیقی مقالہ "فروغ فرخ زاد اور کشور ناہید کا نسائی تصور: تقابلی مطالعہ" سے معنون ہے۔ اس تحقیقی مقالے کا مقصد فروغ فرخ زاد اور کشور ناہید کے نسائی تصور کا جائزہ لے کر ان کی شاعری میں موجود تانیثی شعور کو واضح کرنا ہے جس کے زیرِ اثر ان کی بیشتر تصنیفات وجود میں آئی ہیں۔

زیرِ نظر تحقیقی مقالے میں تقابلی جائزے کا مقصد دونوں شاعرات کے ہاں ادبی معیار مقرر کرنا اور سیاسی و سماجی اور نفسیاتی و جنسی مسائل کے اثرات اور شاعری میں ان کے اظہار کا مطالعہ کرنا ہے۔ ساتھ ساتھ ان تمام محرکات کا جائزہ لینا جن کی بدولت یہ سیاسی و سماجی اور نفسیاتی و جنسی مسائل پیدا ہوئے، شامل ہے۔

ایک مقصد اس تحقیقی مقالے کا یہ بھی ہے کہ اس بات کا جائزہ لیا جائے کہ بظاہر دو مختلف پسِ منظر سے تعلق رکھنے والی، شعور و ادراک کی حامل خواتین کن نکات پر مشترک سوچ رکھتی ہیں اور وہ کون سے عوامل ہیں جن کی وجہ سے ان کے اظہار کی صورتوں میں کچھ اختلافات موجود ہو سکتے ہیں۔ دونوں شاعرات اپنی شاعری میں نسائی شعور کو کس حد تک واضح کر سکی ہیں اور تانیثیت کے حوالے سے ان کے ہاں کون سے معیارات مقرر ہیں۔

اس مقالے میں فروغ فرخ زاد اور کشور ناہید کے تانیثی شعور کا تجزیہ و تفہیم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ تقابل کے عمومی معیارات کے حوالے سے ان کے موضوعات اور ان کی پیشکش کا جائزہ لیا گیا ہے اور قدامت پسند معاشروں میں خواتین کے استحصال کو نسائی زاویہ نگاہ سے پرکھنے کی ان کی کوشش پر بحث کی گئی ہے۔

اظہار تشکر

اس مقالے کی تکمیل کے لیے میں خدائے بزرگ و برتر کی حمد و ثنا اور بے حد شکر گزاری کے اظہار کے بعد اس مقالے کے لیے میری نگران اور صدر شعبہء اردو ڈاکٹر روبینہ شہناز کی انتہائی ممنون و مشکور ہوں۔ جنہوں نے ابتدا سے اب تک ہر قدم پر میرا ساتھ دیا، ہر ہر مرحلے پر ان کی شفقت و محبت میرے شاملِ حال رہی اور مجھے جس وقت بھی ان کی ضرورت محسوس ہوئی وہ تمام کاموں کو پسِ پشت ڈال کر میری مدد کے لیے موجود رہیں۔ اگر چہ ان کی شفقتوں کے لیے شکریہ کا لفظ بہت چھوٹا ہے۔ ڈاکٹر عابد سیال صاحب کی انتہائی مشکور ہوں جن کے مشوروں اور رہنمائی نے مجھے بہت سی چیزوں کو سمجھنے اور سیکھنے کا موقع دیا۔ شعبہء اردو کے دیگر اساتذہ جن میں ڈاکٹر فوزیہ اسلم، ڈاکٹر نعیم مظہر، ڈاکٹر شفیق انجم اور ڈاکٹر رخشندہ مراد خاص طور پر شامل ہیں، جنہوں نے مختلف مواقع پر میری مدد کی اور ہمیشہ شفقت اور محبت سے پیش آئے ان سب کی بہت شکر گزار ہوں۔ شعبہء فارسی کے صدر ڈاکٹر محمد سفیر صاحب کی بے حد مشکور ہوں جنہوں نے اپنی مصروفیات میں سے وقت نکال کر تراجم کے کام دیکھنے میں میری بہت مدد کی اور جب بھی میں نے کام کے سلسلے میں ان سے رابطہ کیا انہوں نے انتہائی خلوص اور مروت کا برتاؤ کیا۔

اپنے والد صاحب جناب امجد اسلام امجد اور سسر محترم جناب انور مسعود صاحب کی خاص طور پر شکر گزار ہوں جنہوں نے ہر قدم پر میرا حوصلہ بڑھایا اور میرے لیے کتابوں کی فراہمی کو آسان اور سہل بنایا۔ اپنے گھر والوں کا میں بہت شکریہ ادا کرنا چاہوں گی جنہوں نے اپنے لیے مختص وقت میں سے مجھے یہ مقالہ مکمل کرنے کا موقع دیا اور نہ صرف میری از حد مصروفیات پر خندہ پیشانی سے پیش آئے بلکہ میرے کام کے حوالے سے مجھے تحریک دی تا کہ میں جلد از جلد اپنا کام مکمل کر سکوں۔

شکریے کی ایک طویل فہرست ہے بہت سے لوگوں نے خلوص و محبت کا اظہار کیا۔ فردا" فردا" سب کا نام لینا ممکن نہیں اور نہ ہی یہ ایک صفحہ سب کے اظہارِ تشکر کے لیے کافی ہے کیوں کہ جو احترام دل میں ہے وہ لفظوں میں ادا کرنے سے قاصر ہوں۔

روشین عاقب

اسکالر ایم فل اُردو

پہلا باب

تقابل اور تانیثیت: بنیادی مباحث

الف) تقابلی مطالعہ کیا ہے:

تقابلی مطالعہ جسے انگریزی میں Comparative Studies کہا جاتا ہے دو یا دو سے زائد اشیاء / علوم میں مشترک خصوصیات اور اختلافات کو سامنے لا کر ان کا تجزیہ کرنا اور معیار کا تعین کرنا کہلاتا ہے۔

تقابلی اداب کی اصطلاح پہلی بار انیسویں صدی کے اوائل میں فرانس میں سنی گئی جب اس عنوان سے فرانسیسی اور کچھ دوسری زبانوں کے ادب پاروں کا انتخاب شائع ہوا۔ برطانیہ کی وارک یونیورسٹی کی پروفیسر سوزن بیسینٹ اس مضمون کی تعریف یوں کرتی ہیں:

> تقابلی ادب مختلف ثقافتوں کے متون کا مطالعہ ہے۔ ایک کثیر العلمی مضمون ہے جس کا تعلق زمان اور مکان کے بُعد میں پیدا ہونے والے ادب کے درمیان رشتوں کے نقوش سے متعلق ہے۔[1]

ایک تعریف اس طرح سے ہے:

> The study of the interrelationship of the literatures of two or more national culture usually of differing languages and especially of the influences of one upon the other. Sometimes: informal study of literary works in translation.[2]

لغت میں جب تقابلی مطالعے کی تعریف دیکھی جائے تو کچھ اس طرح ہوتی ملتی ہے:

دو چیزوں کے درمیان موازنہ خصوصاً یہ معلوم کرنے کے لیے کہ ان میں کیا خصو
صیات مماثل ہیں اور کیا غیر مماثل۔[۳]

ایک اور تعریف یوں ہے:

A comparative research is a research methodology in the social sciences that aims to make comparisons across different countries and cultures.[۴]

دوسرے الفاظ میں تقابلی مطالعہ کو کچھ یوں بیان کیا جاسکتا ہے کہ دو چیزوں یا علوم کا جائزہ اس طرح لیا جائے کہ ان کے اشتراکات اور افتراقات کو سامنے لا کر قدر متعین کی جاسکے ابولاعجاز حفیظ صدیقی اپنی کتاب، "کشاف تنقیدی اصلاحات" میں تقابلی مطالعے کی تعریف کو یوں واضح کرتے ہیں:

موازنہ مشترک بنیاد رکھنے والی دو چیزوں کا تقابلی مطالعہ ہے۔ اصولاً موازنہ میں ترجیح کا سوال شامل نہیں لیکن بالعموم موازنہ کرنے والا ناقد ایک فنکار یا فن پارے کی دوسرے فنکار یا فن پارے پر ترجیح ثابت کرنے کی خواہش سے کلی اجتناب نہیں برت سکتے۔ بعض اوقات نقاد کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ ایک ادب پارے کی دوسرے ادب پارے یا ایک فنکار کی دوسرے فنکار پر ترجیح ثابت کی جائے۔[۵]

بنیادی طور پر تقابلی ادب ایسے ادبی فن پاروں میں دلچسپی رکھتا ہے جو دو تہذیبوں کی ثقافت کو واضح کرتے ہیں۔ ان میں دو مختلف ادبی پہلو تعلقات، انسانی مزاج اور رویوں کے نقوش بھی تلاش کئے جاتے ہیں۔ دو مختلف تہذیبوں کے حوالے سے کیا جاننے والا تقابل یا موازنہ Inter disciplinary کہلاتا ہے۔

اس حوالے سے ۱۸۵۷ء میں اپنے آکسفورڈ کے افتتاحی لیکچر میں میتھیو آرنلڈ کا کہنا ہے:

ہر طرف رشتے بکھرے ہیں جن کے مظاہر ہمیں چاروں اطراف نظر آتے ہیں۔ کسی ادب یا واقعے کی مکمل سمجھ اس کے دوسرے ادب اور واقعات کے ساتھ رشتے کی پہچان سے ہی مل سکتی ہے۔[۶]

گوئٹے نے تقابلی ادب کے حوالے سے اپنے خیالات کا اظہار کچھ یوں کیا ہے کہ دنیا کا ادب یہ ہے کہ آپ کے اندر دیگر اقوام کی ادبی تخلیقات کے بارے میں جاننے کا تجسس اور شوق پیدا ہوا۔ گوئٹے کا یہ بھی کہنا ہے کہ میرے اس علمی و ادبی و تخلیقی سفر کا نچوڑ یہ ہے کہ شاعری تمام انسانوں کی مشترکہ میراث ہے یعنی شاعری عالمگیر ہے اور یہ کسی کا اثاثہ نہیں۔

امریکہ میں تقابلی ادب کے ایک بانی چارلس ملز گے لی نے تقابلی ادب کے طالب علم کا مفروضہ واضح کرتے ہوئے کہا ہے:

> ادب فکر کا ایک واضح اور مربوط میڈیم ہے۔ انسانیت کا مشترکہ اداراتی بیان ہے جس میں تفریق کی وجوہات، فرد کے سماجی حالات، نسلی، تاریخی اور ثقافتی اور لسانی اثرات، مواقع اور قیود ہیں لیکن عہد اور بھیس کی تمیز کے بغیر تقابلی ادب کا منبع وہ مشترکہ انسانی ضروریات اور عزائم ہیں جو ذہن کی مشترکہ نفسیاتی فعلیاتی صلاحیتوں سے جنم لیتی ہیں اور فرد اور سماجی انسانیت کے مشترکہ مادی اور اکتسابی قوانین کی پابند ہیں۔[۷]

اسی قسم کے جذبات کا اظہار ۱۹۷۴ء میں فرانسوا جوسٹ نے کیا تھا کہ جب اس نے اعلان کیا کہ قومی ادب بذات خود ایک معقول میدان علم نہیں بن سکتا۔ کیونکہ اس کا تناظر جان بوجھ کر محدود رکھا جاتا ہے اس کے مقابلے میں تقابلی ادب کی حقیقت ایک علمی مضمون سے بڑھ کر ہوتی ہے یہ انسان دوست ماحول، ادب، ادبیات اور ثقافتی کائنات کی ایک جامع تصویر پیش کرتا ہے۔

مغرب میں تقابلی مطالعوں کے حوالے سے خاصا قابلِ قدر کام ہو رہا ہے اور اگر اس کی ضرورت اور اہمیت کے حوالہ سے دیکھا جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ مغرب میں تقابلی مطالعوں کا دائرہ کار محدود کرنے کی بجائے اسے وسعت دینے کے لیے مختلف اداروں میں تقابلی مطالعوں کے لیے الگ سے شعبے قائم کئے گئے ہیں۔ حاصل شدہ معلومات کو ملکی زبان میں ترجمہ کر کے تقابل کے معیار کا تعین کیا جاتا ہے۔

تقابلی مطالعوں کی اہمیت و ضرورت کا اندازہ درج ذیل باتوں سے لگایا جا سکتا ہے۔

۱۔ تقابلی مطالعوں کی بدولت متعدد لوگوں کو ادب لکھنے کے نئے اور عمدہ موقع فراہم ہوئے ہیں۔

۲۔ تقابلی مطالعہ انسان کو معاشرتی زندگی کی بنیاد فراہم کرتے ہیں۔

۳۔ عالمگیر معاشرے کو مضبوط بنیادیں فراہم کرنے میں تقابلی مطالعہ کا کردار بہت اہم ہے۔

۴۔ تقابلی مطالعوں کی بدولت کلاسیکی ادب سے نہ صرف آگاہی حاصل ہوتی ہے بلکہ اس قیمتی خزانے کو پڑھنے اور سمجھنے کی بنیاد بھی تقابلی مطالعہ میں فراہم کرتا ہے۔

۵۔ دو مختلف تہذیبوں کے ادب کا تقابل کرتے وقت ان تہذیبوں کے کلچر اور زباں سے بطور خاص واقفیت حاصل کی جاتی ہے۔ گویا تقابلی مطالعے کی بدولت ہمیں مختلف تہذیبوں کی زبان اور کلچر (ثقافت) سے بھی آشنائی حاصل ہو جاتی ہے۔

۶۔ تقابلی مطالعہ ایک بین الشعبہ جاتی مضمون ہے۔ اس لیے اس کے تحت ہونے والا مطالعہ بین التہذیبی اور بین اللسانی اقدار کے پھیلاؤ کا سبب بنتا ہے۔

۷۔ تقابلی مطالعہ ایک ایسے ادب کو بنیاد فراہم کرتا ہے جو جغرافیائی حدود و قیود سے ماورا ہے۔

۸۔ تقابلی مطالعے نہایت جاندار ہوتے ہیں ان کی اہمیت اس لیے بھی بڑھ جاتی ہے کہ ان کی بدولت مصنف کی ذاتی سوچ اور اس کے ذہن پر اثر انداز ہونے والی ادبی تحریکوں کے اثرات کا جائزہ بھی لیا جاسکتا ہے۔

تقابلی مطالعوں کی روایت پر اگر غور کیا جائے تو اس کا آغاز مغرب سے ہوتا نظر آتا ہے۔ مغرب میں تین دبستان (school of thought) دکھائی دیتے ہیں۔ جن کے ہاں تقابل کے حوالے سے کام کی ابتدا ہوئی۔

۱۔ فرنچ سکول آف تھاٹ French School of thought

ب۔ جرمن سکول آف تھاٹ Jermen school of thought

ج۔ امریکن سکول آف تھاٹ American school of thought

فرنچ سکول آف تھاٹ تقابلی مطالعوں کی روایت میں ابتدائی قدم کا درجہ رکھتا ہے۔ اس دور میں زیادہ تر ماخذات کے حوالے سے بات کی گئی۔ ان نظریے کی بنیاد اس نکتے پر رکھی گئی کہ ایک نظریہ ایک قوم سے دوسری قوم تک کس طرح منتقل ہوتا ہے۔ اس نظریے کے پس منظر میں کیا محرکات تھے۔ اس دبستان کا دائرہ کار یورپی اقوام سے تقابل تک محدود تھا۔

جرمن سکول آف تھاٹ کا آغاز انیسویں صدی کے آخر میں دکھائی دیتا ہے جو کہ ۱۹۳۹ سے ۱۹۹۵ کے درمیان اپنے عروج پر پہنچا۔ انہوں نے ان مطالعوں کی بنیاد ساختیات پر رکھی۔ مگر وقت کے ساتھ اس کا مزاج بدلنے لگا اور اب ان کی بنیاد Applied Literature پر رکھی جا رہی ہے۔

امریکن سکول آف تھاٹ، فرنچ سکول کے ردِ عمل کے طور پر سامنے آیا ان کے ہاں علاقوں اور تہذیبوں کی قید نہیں رکھی گئی اور تقابل تحقیق کے دائرے سے نکل کر ادبی تنقید میں شامل ہوا۔ امریکن سکول میں تمام دنیا میں لکھے جانے والے ادب کو شامل کیا گیا اور چینی زبان سے لے کر عربی زبان کے ادب کی بات کی گئی اس سکول کی بنیاد گوئٹے کے اصول کو بنایا گیا۔

Poetry is the property of all man kind

تقابلی مطالعہ ایک مسلسل عمل کا نام ہے اور ایک عمل ہونے کے ناطے اس کے کچھ نہ کچھ تقاضے ہیں۔

- دو یا دو سے زائد اشیا کا ہونا
- اشتراکات
- افتراقات
- تعین قدر

سب سے پہلے دو چیزوں کا حصول ضروری ہے جو ایک ہی صنف سے تعلق رکھتی ہوں۔ اگلے مرحلے پر ان میں موجود مشترک معلومات کا پتہ لگایا جائے گا۔ اگر ان میں کچھ مختلف ہے یا کسی نوع کا اختلاف پایا جاتا ہے تو اس پر بات ہو گی اور نتیجے کے طور پر دونوں چیزوں کے معیار کا تعین کیا جائے گا۔

تقابل کی اقسام یوں بیان کی جاتی ہیں:

تقابل کی اقسام

بیانیہ تقابل

Descriptive/Logical

Comparison

تعین قدر

Normative/Rhetorical

Comparison

بیانیہ تقابل میں چیزوں کی ظاہری ساخت و خدو خال کو دیکھا جاتا ہے اور Normative Comparison میں خالصتاً ادب کے حوالے سے تقابل کیا جاتا ہے۔

کسی بھی فن پارے کے تقابلی مطالعے کے لیے داخلی اور خارجی محرکات نہایت اہم ہیں۔ خارجی محرکات میں اس بات کا جائزہ لیا جاتا ہے کہ ادب یا شاعری جس عہد میں تخلیق کی گئی ہو اس عہد کے سیاسی سماجی اور تہذیبی حالات کس قسم کے تھے۔

داخلی محرکات میں ادیب یا شاعر کی شخصیت، اس کے خاندانی حالات، تجربات اور داخلی کیفیات زیر بحث آسکتی ہیں۔

کسی بھی فن پارے کے معیار کا تعین کرنے کے لیے عام طور پر ایک Line of reference بنائی جاتی ہے اور داخلی اور خارجی محرکات کا جائزہ لینے کے بعد ایک معیار مقرر کر کے فن پارے کے جمالیاتی حسن،

نظریاتی، نفسیاتی اور روحانی تمام پہلوؤں کا جائزہ لیا جاتا ہے گویا تمام مراحل سے گزرتے ہوئے تعین قدر اسے بہترین ثابت کرنے میں مددگار ہوتا ہے۔

ب) فیمینزم۔ تعارف:

فیمینزم یا تانیثیت کیا ہے۔ اس کی تعریف کیا ہے۔ کیا یہ مغرب کی دین ہے یا اس کی جڑیں ہمارے ماضی میں پیوستہ ہیں۔ آج دنیا بھر میں خواتین اس بات پر متفق ہیں کہ صدیوں سے انہیں نامساوی سلوک اور تضحیک کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ بحیثیت انسان انہیں کمتر جانا گیا۔ انہیں ذہانت، فکر، دانش، علم و عقل اور تدبر سے عاری مخلوق ثابت کیا گیا ہے۔ تہذیب و تمدن کی تاریخ سے عورت کا وجود غائب ہے۔ ان سب باتوں کو واضح کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ دیکھا جائے کہ فیمینزم یا تانیثیت کیا ہے۔

اس سلسلے میں انیس ہارون کا کہنا ہے:

> عموماً اس تحریک کو مغرب زدگی اور خواتین کی بے لگام آزادی سے منسوب کیا جاتا ہے۔ آپ نے خواتین سے یہ بھی سنا ہو گا کہ ہمارے ملک میں عورت دوہرے استحصال کا شکار ہے یا ان پر بڑا ظلم ہوتا ہے مگر دوسرے ہی سانس میں وہ کہتی ہیں کہ 'میں فیمینسٹ نہیں ہوں' ان میں پیشہ ور خواتین سے لے کر ادیب شاعر بھی شامل ہوتی ہیں۔ جو ہمیشہ عورتوں کے حق کے لئے آواز بلند کرتی ہیں۔ مگر اپنے آپ کو فیمنسٹ کہلانا پسند نہیں کرتیں۔ کیونکہ کے ذہن میں یہ ایک مغربی نظریہ ہے جسے مردوں سے نفرت، انتہا پسند نسوانیت اور گھر تباہ کرنے کی محرک سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ حقیقیت نہیں ہے۔ خواتین پر ظلم و زیادتی کے خلاف آواز اٹھانا اور ان کے حقوق کی بات کرنا فیمینزم ہے۔[۸]

نسائیت، تانیثیت یا فیمینزم کی متعدد تعریفیں متعین کی جاتی ہیں۔ انسائیکلوپیڈیا بریٹینیکا کے مطابق:

فیمینزم ایک سماجی تحریک ہے جو عورتوں کے مساوی حقوق کے لیے جدوجہد کرتی ہے۔[۹]

ایک تعریف یوں کی جاتی ہے:

Feminism is an 'awareness of women's oppression and "Exploitation in society, at the place of work, within the family And conscious action to change this situation.'[۱۰]

ایک اور تعریف اس طرح ہے:

فیمینزم اس احساس کا، کہ معاشرے میں عورت مظلوم ہے اور اس کا استحصال کیا جاتا ہے، اور اس صورتِ حال کو بدلنے کی شعوری کوشش کا نام ہے۔[۱۱]

مندرجہ بالا تمام عبارتوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ تانیثیت ایک فلسفۂ حیات اور اندازِ فکر کا نام ہے اور ایک عملی تحریک بھی ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس کے پیچھے نہ کوئی تنہا نظریہ یا فلسفۂ موجود ہے اور نہ ہی اس میں باقاعدہ جدوجہد کا وہ تصور نظر آتا ہے جو تحریک کی اصطلاح سے وابستہ ہے۔

اس جدوجہد کے دو رخ نظر آتے ہیں

۱۔ فلسفیانہ یا نظریاتی

۲۔ عملی

فیمینزم کے عملی رخ کی بات ہوتی ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ فیمینزم کی اس تحریک کو نظریہ موج کے ذریعے پیش کیا جاتا ہے۔ پہلی لہر، موج یا wave انیسویں صدی سے بیسویں صدی کے نصف اول تک ہے۔ اس عرصہ میں عورتوں کی ملازمت کی یکساں اجرت، جائیداد اور ملکیت کے حقوق، بیوی کے حقوق اور ووٹ کا حق جیسے مسائل کے لیے عملی جدوجہد ہوئی۔ اٹھارویں صدی میں یورپ میں علم و دانش کا چرچا عام ہوا۔ اس صدی کے آغاز میں ہولڈ برگ اور کینیڈ وارسٹ اور ہال بیک نے یہ مطالبہ کیا کہ عورت کو دیگر انسانوں کی طرح انسان سمجھا جائے۔ ان کو شہریت اور تعلیم کا حق دیا جائے۔

۱۷۸۷ء میں امریکی پارلیمنٹ میں بھی اس مسئلے پر بحث ہوئی کہ عورت کو ووٹ کا حق ملنا چاہیے۔ آزادی اور برابری کے نعرے جب سماعتوں کا حصہ بنے تو یہ امید تقویت پکڑنے لگی کہ اب عورتوں کو بھی ایک انسان کامل کا درجہ مل جائے گا۔ ۱۸۴۸ء میں یہ بات سامنے آئی کہ سیاست میں عورت کے حق کو تسلیم کیا جائے اور خواتین کو سیاست میں حصہ لینے کا باقاعدہ حق ملنا چاہیئے۔

دوسری لہر یا موج کی عملی صورت ۱۹۹۰ء سے ۱۹۹۸ء کے درمیان واضح ہوتی ہے۔ اس عرصے میں نجی یا گھریلو مسائل کو سیاسی مسائل کا The personal is political قرار دیا گیا۔ اسی دور میں "آزادئ نسواں" کا تصور سامنے آیا۔ گھریلو کاموں، بچوں کی ولادت اور تربیت اور ضعیفوں کی خدمت جیسے کاموں کی قدر اور قیمت متعین کرنے کے سوالات اٹھائے گئے۔

اس کے بعد آج تک فیمنزم کی تیسری لہر یا موج کا عہد تصور کیا جاتا ہے۔ مغربی فیمینزم کا یہ رُخ ہے جو اس کے نظریاتی پہلو سے پوری طرح جڑا ہوا ہے۔

اس سلسلے میں محمد عقیل کا کہنا ہے:

> تانیثیت ایک نیا فکری تصور ہے جو بیسویں صدی کے نصف کے بعد مغربی فکر اور تنقیدی تصورات میں روز بروز اپنا دباؤ ڈالتا جا رہا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اپنی احتجاجی صورتوں کو بھی واضح کرتا جا رہا ہے۔ احتجاج ان معنوں میں کہ مرد کی بنائی ہوئی اس سوسائٹی میں نہ صرف عورتوں کو زندگی میں مواقع کم فراہم کیے جاتے ہیں بلکہ زندگی کی ارتقائی پیش قدمیوں میں عورت کو یا تو پیچھے دھکیل دیا جاتا ہے یا اس کی کوششوں کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی۔ [۱۲]

فیمینزم کی عملی تحریک کے پیچھے ان فلسفیانہ نظریات اور مباحث کا بڑا حصہ ہے جو فیمینسٹ ادیبوں نے اپنی تصانیف میں پیش کیے۔ دوسری جنگِ عظیم کے بعد اس تحریک نے خاص طور پر زور پکڑا اور عملی کامیابیاں بھی حاصل کیں۔

اس سلسلے میں پہلا اہم اظہار یہ "A vindication of the rights of women" شائع ہوا۔

۱۸۵۴ء میں مارگریٹ فلر نے "women in the 19th century" لکھی۔ اس کے بعد آزادیِ نسواں کا تصور تیزی سے مقبول ہوا۔Virginia Woolf نے ایک طویل مضمون ۱۹۲۹ء میں تحریر کیا جو کتابی صورت میں A room of one's own کے نام سے شائع ہوا۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد فرانسیسی ادیبہ سیمون ڈی بوار کی کتاب سامنے آئی۔ یہ کتاب فیمینزم کا بے حد اہم سنگِ میل سمجھی جاتی ہے۔ اس کا نام "Second Sex" ہے۔

اس کتاب میں انسانی وجود کی انقلاب انگیز بحث اٹھائی گئی۔ سیمون نے عورت کے وجود کے متعلق مباحث چھیڑے مثلاً یہ کہ عورت کیا ہے، 'کیا عورت کا وجود قائم بلذات ہے یا اضافی'۔ 'کیا صنف مخالف کی موجودگی سے ہی اس کا وجود ممکن ہے'۔ 'اگر تذکیر کے بغیر تانیث کا وجود نہیں تو اس قاعدے کی رُو سے تذکیر بھی اپنے وجود کے لیے تانیث کا محتاج ہے'۔ تو پھر ایسا کیوں ہے کہ عورت مرد کی نسبت سے پہچانی جاتی ہے مگر مرد کا عورت کی نسبت سے پہنچانا جانا تذلیل کا باعث سمجھا جاتا ہے۔

اصل بات سیمون نے یہ کہی کہ زندگی میں جو عورت ہر جگہ ناکارہ اور مرد مرد کر کے پیچھے دھکیل دی جاتی ہے اسے زندگی کا ایسا رخ دکھایا جاتا ہے کہ بس یہی تمہاری جگہ ہے اور یہیں تم کو اصل خوشی مل سکتی ہے اور یہی تمہارا کام ہے۔ ایسی پابندیاں لگا کر اس استحصال پر ہمیشگی کی مہر لگا کر عورت کو گلنے سڑنے کے لیے چھوڑ دیا جاتا ہے۔

سیمون نے اپنی گفتگو کو اس طرح سمیٹا ہے:

> آزاد عورت ان باتوں سے چھٹکارا پا کر ہی وجود میں آئے گی۔ جو آ رہی ہے۔ یہ بتانا تو مشکل ہے کہ اس کے تخیلات کی یہ دنیا مردوں سے کس قدر مختلف ہو گی۔ کتنا فرق عورت کی اس دنیا میں مرد کی دنیا سے ہو گا۔ مگر عورت کی دنیا کا یہ فرق عورتوں کی ترقی کے امکانات کو روشن کرے گا۔ ایسے امکانات جنہیں مردوں نے دبا کر

suppressed کر دیا تھا اور انسانیت کے لیے وہ گم ہو چکے تھے۔ اب یہ بہترین اور مناسب موقع ہے کہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اپنی بھلائی کی فکر کرے۔[۱۳]

تانیثیت کے تصور کو واضح طور پر سمجھنے اور کسی بھی سماج کی تشکیل و ترقی میں اس تصور کی اہمیت کو واضح کرنے کے لیے ہمیں ابتداء سے اب تک مختلف معاشروں اور تہذیبوں میں خواتین کے ساتھ کیے جانے والے مساوی و نامساوی سلوک کا جائزہ لینا ہو گا تا کہ معلوم ہو سکے کہ یہ سوچ جس کو فیمینزم کہا جاتا ہے در حقیقیت عورت کے اس طویل دورِ ابتلاء اور اس جدوجہد کی کہانی ہے جس میں اس نے خود شناسی کی بڑی کٹھن منزلیں طے کی ہیں۔

۱) تانیثیت۔ روایت

ایک اندازے کے مطابق کرہ ارض پر انسان کم و بیش پانچ لاکھ سال سے آباد ہے۔ قدیم علمائے تاریخ نے انسانی تہذیب کے تین ادوار متعین کیے ہیں جن میں سے قدیم ترین عہد پتھر کا عہد ہے۔ پتھر کے زمانے کا دورانیہ پانچ ہزار سال قبلِ مسیح تک قائم رہا۔ بعد میں کانسی اور لوہے کا عہد شروع ہوا جو کہ آج تک جاری ہے۔ انسانی زندگی اور تہذیب کے اس سفر میں کئی زندگیاں ختم ہوئیں اور کئی زندگیوں نے جنم لیا۔ کئی تہذیبیں صفحۂ ہستی پر نمودار ہوئیں اور بے شمار پرانی تہذیبوں کے صرف آثار باقی رہ گئے۔ انسانی تصورات، رسومات، روایات بنتے بگڑتے رہے اور یہ تب تک جاری رہے گا جب تک اس کرۂ ارض پر زندگی موجود ہے۔ تاریخ کا یہ پانچ لاکھ سالہ سفر انسان کی دو قسموں مرد اور عورت کے وجود کا مرہونِ منت ہے۔

آج ہم ایک پدر سری معاشرے میں زندگی گزار رہے ہیں مگر ہمیشہ ایسا نہیں تھا۔ لہذا بات جب عورت کے حوالے سے کی جائے تو اس کی سماجی و سیاسی حیثیت جاننے کے لیے مختلف تاریخی ادوار کا مطالعہ نا گزیر ہو جاتا ہے۔ مرد کی برتری کا رواج زرعی انقلاب کے بعد شروع ہوا۔ اس سے پہلے کا معاشرہ مادری تھا جس کا مرکز و محور عورت تھی اور اسے مرد پر برتری حاصل تھی۔ بچے باپ کے بجائے ماں کے نام سے پہچانے جاتے تھے۔ باپ کی حیثیت گھر میں ایک ضمنی مددگار کی سی تھی۔ انسانی تاریخ میں جب انسان ارتقائی ترقی کرتا ہوا

کاشت کاری کے عہد میں داخل ہوا تو عورت ہی کے ہاتھوں زراعت کی ابتداء ہوئی۔ دنیا کی قدیم ترین معلوم تہذیب و تمدن کے آثار 'سومیر' عراق کے ایک علاقے سے دریافت ہوئے۔ اس وقت کی عورت خاصی متحرک دکھائی دیتی ہے۔ وہ اس وقت کی پوری سماجی زندگی میں فعال اور موثر حیثیت کی حامل نظر آتی ہے۔

ابنِ حنیف رقم طراز ہیں:

> عورت چونکہ شروع سے ہی غذائی نباتات جمع کرتی چلی آ رہی تھی اس لیے خود رو پودوں کی نگہداشت کرتے کرتے گندم کی افادیت بھی اس نے معلوم کی۔ اس عورت کے ہاتھوں ہی سب سے پہلے عراق میں زراعت کی ابتداء ہوئی اور اس عورت نے ہی انسانی زندگی میں تمدنی انقلاب برپا کر دیا۔ چنانچہ زراعت کاری کے ساتھ ساتھ مادری تہذیب کا بھی آغاز ہوا۔[۱۴]

عورت نے فصلیں اگانے کا راز دریافت کیا تھا۔ وہ بیج جنتی تھی اور زمین کی کوکھ سے فصلیں اگاتی تھی۔ اس لیے دھرتی کو ماں کہا جانے لگا اور انسانی ماں کی طرح وہ بھی بارآوری، تولید اور افزائش کی علامت بن گئی۔ چنانچہ قدیم ترین تقریباً تمام مذاہب میں ایسی دھرتی دیویاں دکھائی دیتی ہیں جنہیں مشفق ماں سمجھ کر عقیدت اور سپردگی سے ان کی پوجا کی جاتی تھی۔

> جب انہوں نے ضروریاتِ زندگی اور روئیدگی کے تمام لہلہاتے سوتے شکمِ زمین سے پھوٹتے دیکھے تو رفتہ رفتہ ان کے دلوں میں زمین کی ایسی پروردگی اور عنائت اور شفقت کے لیے تشکر و امتنان اور بعد ازاں گہرے عبودیت طلب اور تقدیس آمیز جذبات بیدار ہونے شروع ہوئے۔ چونکہ اس مادری نظام میں عورت زندگی کے تقریباً ہر شعبے پر حاوی تھی اس لیے زراعت کاروں نے تہذیب کا منبع بھی کسی غیر مرئی مونث ہستی کو قرار دیا۔ غرض ان جملہ وجوہات، روئیدگی زمین، عورت کی سماجی برتری اور تولید کے مذکورہ مسلسل چکر کی رعایت سے اظہارِ عبوریت کی خاطر قدرتاً

ان کے مقدر نے کسی دیوتا کی بجائے عہد حجریہ کی اس قدیم اور موہوم سی دیوی کو
باقاعدہ معبود کی شکل دے دی۔[۱۵]

سومیری تہذیب کی ایک اہم دیوی کا نام عشتار دیوی تھا۔ سومیریوں کی تہذیب میں ایک عورت کا بطور بیوی کے تصور بہت عمدہ اور دلفریب تھا۔ سومیریوں کے نزدیک بیوی جہاں خوبصورت، اعلیٰ حسن کی مالک، دلفریب اداؤں کی علامت تھی وہاں اس کا مقدس ہونا بھی ضروری تھا۔

مصری تہذیب میں ماں کو بہت اہم رتبہ حاصل تھا۔ فراعین کے دور تک عورت کی اجارہ داری قائم تھی اور اس کا مقام سلطنت کی ملکہ کا تھا۔ گو کہ وہ حکمران بن کر تخت پر براجمان نہیں ہو سکتی تھی مگر ایسی ملکہ بھی گزری ہے جو بادشاہ شوہر کے ہوتے ہوئے بھی حکمرانی کرتی رہی۔

انیس سال تک ان دونوں میاں بیوی نے مل کر حکومت کی لیکن نااہل شوہر کی حیثیت
محض ایک نمائشی اور کٹھ پتلی کی تھی۔ زیرک ملکہ نے اسے کبھی بھی سیاسی اہمیت یا
عوام سے رابطہ رکھنے نہ دیا۔ احکام وہ جاری کرتی۔ شکایات اور مقدمات کی سماعت
کرتی۔ فیصلے اسی کے نافذ ہوتے۔ غرض سلطنت کے تمام کام وہ انجام دیتی۔[۱۶]

مصری تہذیب کے مقابلے میں اگر یونانی تہذیب کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ علم و دانش کی علامت یونانی تہذیب میں عورت کی سماجی حیثیت ایک محدود دائرے میں مقید تھی۔ عورت کی تخلیق اور پیدائش سے متعلق یونانی دیومالا کے تصور سے ہی تصویر کافی حد تک واضح ہو جاتی ہے۔

زیوس دیوتا کے حکم سے جب ہیفس ٹس دیوتا نے دنیا کی پہلی عورت پنڈورا کا گیلی مٹی
سے پتلا بنایا تو افرودیتی نے پنڈورا کو جمال اور دلآویزی کے ساتھ ساتھ خوش و شاد کام
کرنے کا فن بھی عطا کیا۔ اتھینی دیوی نے اس پتلے میں زندگی پھونکی لباس پہنا کر ستر
پوشی کی۔ قیمتی زیور دیے اور زنانہ میں مہارت بخشی۔ کرائی ٹی نے اسے موہ لینے کی
قدرت عنائت کی۔ ایوالون نے نغمہ سرائی کی صلاحیت دی۔ ترغیب و تحریص کی
دیوی پی تھو نے زیور دیئے۔ ہرمیز نے پنڈورا کو خوش کلامی بے باکی، مکر و عیاری، دغا

بازی اور خوشامد سکھائی۔ موسموں کی دیوی ہوری نے اسے دلکش پھولوں کے ہاروں سے سجایا۔ دوسرے دیوی دیوتاؤں نے خوبصورت کپڑے اور طلائی تاج دیا۔ زیوس نے پنڈورا کو ایک صندوقچہ دیا جس میں بڑھاپا بیماریاں، پریشانیاں، زحمت، پاگل پن غرض سارے دکھ اور مصیبتیں گناہ، شہوانیت اور سب سے نیچے امید بند تھی۔[۱۷]

سو قدیم سمیریا کی نانا، بابلیوں کی عشتار، فلسطین کی عشرتی، فریگیا کی سانی بیلی، ایران کی ناہتا، یونان کی افراودیتی اور ہندوستان کی اُما دھرتی دیویاں تھیں۔

ہندوستان میں آریاؤں نے دراوڑوں سے دھرتی ماتا مستعار لی جو ویدوں میں پرتھوی اور بعد میں اُما یا درگا کی صورت میں نمودار ہوئی۔ اسی طرح لنگم یونی اور گئوماتا کے تصورات بھی دراوڑوں سے لیے گئے ہیں۔سیتا دھرتی دیوی تھی۔ بھوئیں کی پوجا ہر گھر میں ہوتی تھی۔ لوگ اس کے ننھے منے بت بنا کر طاقچوں میں سجاتے تھے۔ پنجاب میں آج بھی کاشت شدہ اراضی کو بھوئیں کہتے ہیں۔ شکتی کے بھگت اس کی پوجا ماں کی صورت میں کرتے تھے۔[۱۸]

عورت کی سماجی حیثیت یہودیت کی آمد تک کوئی خاص قابلِ قدر نہ رہی۔ اس کے بعد یہودی مذہبی تعلیمات و احکامات میں بھی عورت کو غلام کا درجہ حاصل تھا۔ یہودیت میں عورت کو برائی کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ خاوند کو بیوی پر مالکانہ حقوق حاصل تھے۔ وہ اسے بدکاری کے شبے میں مار سکتا تھا۔ کنیز بنا کر فروخت کر سکتا تھا۔ اس کی ناک یا کان کاٹ سکتا تھا۔ منکوحہ کے علاوہ کنیزیں رکھ سکتا تھا اور کسبیوں سے بھی فیض یاب ہو سکتا تھا۔ دوسرے لفظوں میں تمام قاعدے قانون صرف عورتوں کے لیے تھے اور مرد کسی قانون کے دائرے میں نہیں آتے تھے۔

اس حوالے سے ڈاکٹر عصمت جمیل کا کہنا ہے:

یہودی گھرانے میں باپ کی حکمرانی ہوتی تھی۔ فرزندانِ اسرائیل کا ہر گھرانہ متعدد بیویوں، لونڈیوں، ان کے بچوں جو پیدائشی طور پر غلام اور کنیزیں جانے جاتے

تھے، پر مشتمل ہوتا تھا۔ گھرانے کا سربراہ جسے یایوشے کہا جاتا تھا، خاندان پر مکمل حق رکھتا تھا۔ وہ چاہتا تو بچوں کو زندگی کا حق دے دیتا ورنہ ان کی قربانی بھی دے سکتا تھا۔ اگر بیٹے کی موت کے بعد بہو زنا کی مرتکب ہو جاتی تو وہ اسے زندہ جلا سکتا تھا۔[۱۹]

نسلِ انسانی کے ارتقاء میں عورت کے حالات کی جان کاری کے بعد یہ دیکھنا تھا کہ ہندوستانی سماج میں عورت کی حیثیت مختلف عہدوں میں کیا تھی اور اسے کن نشیب و فراز سے گزرنا پڑا۔ اس مقصد کے پیشِ نظر ہندوستان کے تہذیبی ارتقاء کا مطالعہ بھی ناگزیر ہے۔ جس سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ابتدائی دور میں ہند آریائی تہذیب مادری تہذیب تھی۔ آریا لوگ اس عہد میں ہندوستان میں خانہ بدوش کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ ابھی جاگیر دارنہ نظام کی بنیاد نہیں پڑی تھی اس لیے اس عہد کی سوسائٹی میں عورت کا سماجی مرتبہ بلند تھا۔ ویدک عہد کے ختم ہوتے ہوئے حالات میں عظیم تبدیلی رونما ہوئی۔

پدری تہذیب کے استحکام کے ساتھ ہی عورتوں کی برتری کا خاتمہ ہو گیا۔ ان کی اہمیت میں کمی کا ایک اہم سبب برہمن مذاہب کا عروج تھا۔ جس کی وجہ سے سماج میں ذات پات کی تقسیم پیدا ہوئی۔ عورتوں کو اچھوتوں کے زمرے میں شامل کر لیا گیا۔ ملکیت میں ان کا حصہ نہ رہا اور وہ تعلیم سے بھی محروم کر دی گئیں مہابھارت اور رامائن کی داستانوں سے جو علی الترتیب ویدک عہد کے ابتدائی اور آخری دور سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس عظیم تغیر کا اندازہ ہوتا ہے جو عورت کی سماجی حیثیت میں پیدا ہوا۔[۲۰]

منوشاستر میں عورت کے لیے بہت سے سخت احکامات موجود ہیں۔ عورت کو جتنا ذلیل کیا جا سکتا تھا، کیا گیا۔ برہمن بھی عورتوں کو ستی ہونے کی ترغیب دیتے رہتے تھے کیونکہ ان کی موت کے بعد ان کے سونے چاندی کے زیورات برہمنوں کو ملتے تھے۔ غریب بیواؤں کو ستی ہونے کی ترغیب نہیں دی جاتی تھی۔ اس تہذیب میں جب مرد برسرِ اقتدار آئے تو انہوں نے کمسن لڑکیوں سے شادی بیاہ کی رسموں کی سرپرستی کی۔ عورتیں جنسی تشدّد کا نشانہ بننے لگیں۔ پروہتوں نے غلط انداز سے شعوری طور پر عورتوں کی تذلیل کے لیے شاستروں کی من پسند اور غلط توجیہات پیش کیں۔ ہندوؤں کی مقدس کتاب "رِگ وید" میں عورتوں کے

ساتھ اچھا برتاؤ کرنے اور ان کی عزت و تکریم کرنے کا درس موجود ہے۔ رِگ وید میں ستی کرنے کے حوالے سے بھی کوئی حکم موجود نہیں ہے۔ جبکہ منوشاستر میں عورت کو ستی کرنے پر بہت زور دیا گیا ہے۔

ماضی قریب تک ہندو مذہب میں ستی کی رسم عام تھی۔ عورت کو یہ بتایا جاتا کہ اس کی ذات کسی اہمیت یا مرتبے کی حامل نہیں ہے۔ وہ ایک مرد کے تابع ہے اور ہمیشہ ایسے ہی رہے گی۔ کسی عورت کا شوہر اگر مر جاتا تو اس سے قطع نظر کہ اس کی عمر کیا ہے زندگی کی ہر نعمت اس پر حرام کر دی جاتی۔ اسے کسی شادی بیاہ یا خوشی کی تقریب میں شامل ہونے کی اجازت نہ ہوتی۔ اس کا سر مونڈ دیا جاتا۔ جوتے پہننے کی مناہی ہو جاتی۔ خوراک گھٹا دی جاتی۔ برے خیالات اور وسوسوں سے بچاؤ کی خاطر آرام دہ بستر پر سونا بھی ممنوع قرار پاتا۔ گویا اس کی سماجی زندگی کی ڈور اس کے شوہر کی سانسوں کے ساتھ بندھی ہوتی تھی اور شوہر کے مرتے ہی اسے ایک زندہ لاش میں تبدیل کر دیا جاتا تھا۔

> اس رسم کی تاریخ ہماری توجہ دوسرے قدیم تمدنوں کی جانب مبذول کرواتی ہے۔ بہت سی قدیم قومیں مردہ کے ساتھ اس کی بیواؤں، گھوڑوں اور دوسری محبوب اشیاء کو جلا دیتی تھیں یا دفن کر دیتی تھیں تاکہ دوسری دنیا میں اس کو وہ سب چیزیں دستیاب ہو سکیں جن سے وہ محبت کرتا تھا، یا جن کی اس کو ضرورت ہوتی تھی۔[۲۱]

دھیرے دھیرے ایک ایسا سماجی نظام وجود میں آیا جس میں حاکمِ اعلیٰ کا درجہ مرد کے حصے میں آ گیا اور عورت محض اس کی ملکیت بن کر رہ گئی۔ اس کا وجود ختم ہوتا گیا اور حیثیت پر سوالیہ نشان لگتا گیا۔

دینِ عیسوی میں ابتداً عورت کا مقام قدرے بلند تھا جس کا اندازہ حضرت عیسیٰ کے اولین اعلان سے لگایا جا سکتا ہے۔ مگر آہستہ آہستہ عیسائیت کے مذہبی اجارہ داروں نے عورت کو پسماندہ رکھنے کے لیے باقاعدہ جتن کیے۔ چرچ نے عورت کے خلاف خوب پروپیگنڈہ کیا۔ اسے ایک ناپاک چیز کے طور پر پیش کیا۔ عیسائی مبلغوں نے عورت کے اس تعلق کو جو اس کا جنسِ مخالف کے ساتھ تھا ایک ناجائز اور حرام عمل قرار دے دیا۔ اور ان کے اس عمل سے رہبانیت کے تصور کو فروغ ملا۔

> چرچ کی جانب سے عورت کی اس قدر برائیاں کی گئیں کہ نفسیاتی طور پر عورت خود اپنی ذات سے شرمندہ ہونے لگی اور اس خیال سے کہ وہ ہر گناہ اور خرابی کی جڑ ہے اور دنیا کی تمام برائیاں اس کی وجہ سے ہیں وہ ان کا کفارہ ادا کرنے میں لگی رہی اور رفتہ رفتہ صورت حال یہ ہو گئی کہ وہ اپنی خوب صورتی، اپنے لباس اور اپنی زینت وزیب پر شرمندہ ہونے لگی۔ کیونکہ وہ یہ سمجھتی تھی کہ اس سے لوگوں کو گناہ کے لیے ورغلایا جاتا ہے۔[۲۲]

عورت کے بارے میں عجیب وغریب تصورات کو رواج دیا گیا مثلاً عورت کی آواز مت سنو، وہ جادو کر دیتی ہے۔ جتنا ممکن ہو مرد کو اس سے دور رہنا چاہیئے کیوں کہ وہ ہر لحاظ سے ناقابلِ اعتبار ہے۔ یہودی اور مسیحی تصور نے پیدائشی عقیدے کا سارا بوجھ عورت پر ڈال دیا تھا یہ کہہ کہ آدم کی لغزش کا باعث بھی محض عورت تھی۔ چرچ نے عورت کے خلاف نفرت کو فروغ دے کر اسے ایک ناپاک چیز قرار دے دیا تھا۔ اسے گھر میں قید رہنے پر مجبور کیا جاتا تھا۔ کیوں کہ اگر عورت گھر سے باہر نکلے گی تو مرد کو اپنی طرف راغب کر لے گی اور معاشرہ تباہ ہو جائے گا۔ عورت کو شیطان کے آنے کا دروازہ اور شجرِ ممنوعہ کی طرف لے جانے والی کہا گیا۔

شبلی نعمانی کا کہنا ہے:

> کلیسا نے عورت کو یہاں تک گرا دیا کہ ۵۸۶ء میں آئمہ کلیسا کی مجلس میں اس بات پر زور دار بحث ہو گئی کہ عورت انسان ہے یا نہیں۔ بڑی رد و قدح کے بعد اسے معمولی اکثریت کے ساتھ انسان تسلیم کیا گیا۔[۲۳]

یہ ایسے بے معنی مفروضات تھے جس سے عورت کو ایک جیتی جاگتی، سانس لیتی، عقل و شعور رکھتی عورت کے بجائے ایک ناگزیر برائی، ایک پیدائشی وسوسہ، ایک مرغوب آفت، ایک خانگی خطرہ اور ایک آراستہ مصیبت کے نام سے یاد کیا جانے لگا۔

شرافت حسین کا کہنا ہے:

عیسائیت کی بنیادی تعلیم میں یہ شامل تھا کہ حوا نے آدم کو اکسایا نتیجتاً عیسائیت کے ہر دور میں عورت مطعون رہی۔ مسیحی ادوار میں ایک عام عورت کی کوئی حیثیت نہ تھی بلکہ وہ لونڈی سے بھی بد تر زندگی بسر کرنے پر مجبور تھی۔ سولہویں اور سترہویں صدی میں جادو اور سحر کے الزام میں الیگزینڈر ششم نے ۱۴۴۰ء میں، لوئی دہم نے ۱۵۲۱ء میں، اوڈرین ششم نے بے دریغ عورتوں کو جادو اور سحر کے الزام میں پھانسی، گلوٹین اور نذر آتش کیا۔ یورپ میں عورتوں کو موت کے گھاٹ اتارنے کے لیے پانی کا ٹب بھی ایک طویل مدت تک رائج رہا۔ [۲۴]

آزادی کا بیج فطرت نے مرد اور عورت کے ہاں یکساں رکھا ہوا ہے۔ اگر آزادی کے فطری اظہار پر پابندی لگا دی جائے تو بھی فطرت اپنا راستہ خود بخود نکال لیتی ہے۔ یہ ایک ایسا جوہر ہے جس کو جتنی شدت سے دبایا جائے، یہ اتنے ہی زور سے ابھر کر اپنے آپ کو منوا لیتا ہے۔ چرچ نے عورتوں کے اوپر بے جا اور ناروا پابندیاں عائد کر دی تھیں اور زبردستی راہب خانے قائم کر دئے۔ حالانکہ چرچ کے پاس حضرت مریم کا پاکیزہ اور مقدس تصور موجود تھا۔

سید امیر علی کے مطابق:

بعد کے زمانے میں بالخصوص اس وقفے میں جو مغربی سلطنت کی بربادی اور یورپ میں جدید معاشرت کے ظہور کے درمیان گزرا یعنی ان صدیوں میں جنہیں یورپ نے قتل و غارت اور حرص و ہوس کی صدیاں کہا ہے عیسائیت نے راہب خانے قائم کر کے عورتوں کی حالت کو سنبھالا دینے کی کوشش کی لیکن درحقیقت عورتوں کا اغوا عام تھا۔ اخلاقی حالت بدترین تھی۔ راہب خانے نیکوکاری اور پرہیز گاری کی علامت نہ تھے۔ اور تجرد کی تلقین عفت و عصمت کی یقینی ضمانت نہ تھی۔ [۲۵]

ساتویں صدی عیسوی میں جب اسلام کا ظہور ہوا تب تک دنیا اس حقیقیت سے نا آشنا تھی کہ مردوں کے مقابلے میں عورتوں کے بھی کچھ حقوق ہو سکتے ہیں۔ اسلام کی آمد کے وقت انسانی تہذیب و معاشرت آقا

اور غلام کے طبقوں میں تقسیم تھی۔ ان دونوں طبقات کے معیارِ زندگی میں زمین آسمان کا بُعد موجود تھا۔ ایک طبقے کے پاس زندگی کی ہر نعمت موجود تھی جبکہ دوسرے کے لیے صبح سے شام کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ قبائلی نظام اپنی تمام اچھی بری باتوں کے ساتھ موجود تھا۔ یہ ایک پدرسری معاشرہ تھا۔ سارے اختیارات مرد کے پاس موجود تھے۔ عمومی طور عورت کی حالت نہایت قابلِ رحم تھی۔ بچیوں کو پیدا ہوتے ہی زندہ زمین میں گاڑ دینے کا رواج جاری تھا۔ عورت کو منقولہ جائیداد کی طرح وراثت میں منتقل کر دیا جاتا تھا۔

ڈاکٹر نوال سعدوی کا کہنا ہے:

> عورت کی حیثیت ان معاشروں کے رائج معاشرتی اور معاشی نظام وضوابط کے تابع تھی۔ اس لیے لازم تھا کہ لوگوں کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کو ختم کرنے اور معاشرے کی بنیاد میں تبدیلی لانے کی کوشش کسی نہ کسی حد تک عورتوں کی حیثیت پر بھی اثر انداز ہوئی۔ یہودیت، عیسائیت اور اسلام کی لائی تبدیلیوں کے ابتدائی ادوار میں یہ عمل زیادہ ہوا لیکن تینوں مذاہب خصوصاً یہودیت میں مرد کے مقابلے میں عورت کا مقام کم تر ہی رہا۔[۲۶]

اسلام نے عورت کو قابلِ احترام جانا اور اسے ذلت ورسوائی کے گڑھے سے نکال کر عزت کے تخت پر بٹھایا۔ عورت کو ماں بہن، بیٹی، بیوی کی حیثیت سے بلند مقام دیا گیا۔ اس کے حقوق کا تعین کیا گیا اور اس کو تحفظ دیا گیا۔ قرآن مجید میں یہ واضح طور پر اعلان کیا گیا کہ زندگی کی دوڑ میں مرد اور عورت ایک دوسرے کے معاون ومددگار ہیں۔ عورت اس لیے پیدا نہیں کی گئی کہ اسے دھتکارا جائے یا شاہراہ حیات سے کانٹے کی طرح ہٹا دیا جائے۔ عورت کا وجود بھی زندگی کو قائم رکھنے کے لیے اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ ایک مرد کا۔ عورت کی شمولیت کے بغیر تو مرد کی پیدائش ہی ممکن نہیں تو اسے یہ حق کیسے حاصل ہو سکتا ہے کہ جو مقام اللہ نے عورت کے لیے متعین کر دیا ہے اس میں اپنی مرضی سے کمی بیشی کر سکے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اللہ تعالیٰ نے مومن مردوں اور مومن عورتوں سے ایسے باغوں کا وعدہ کر رکھا ہے
جن میں نہریں بہتی ہیں۔ اس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔[۲۷]

اسلام نے نظامِ معاشرت کے اصول بھی طے کیے اور ان کے تحت کفالت کی ذمہ داری مرد پر ڈالی گئی۔ مرد ہی نان نفقہ کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا۔ اسلام نے وراثت کے قوانین بھی وضع کیے۔ عورت کی معاشی حیثیت کو مضبوط کیا۔ اسلام کے آئینی نظام میں عورتوں کو ایسے حقوق عطا ہوئے جو اس سے پہلے کبھی انہیں حاصل نہ تھے۔ اسلام نے انہیں ایسی مراعات بخش دیں جن کی آج کے زمانے میں اہمیت اور بھی بڑھ گئی ہے۔

اسلام نے تو عورتوں کو مکمل عائلی اور تمدنی حقوق تفویض کیے ہیں۔ اسے پاکیزگی، محبت، اخلاص اور سکون و اطمینان کا آئینہ دار قرار دیا ہے عورتوں کی آبرو اور مال کا تحفظ معاشرے کی ذمہ داری ٹھہرائی ہے بلکہ عورت کو کمزور صنف ہونے کی رعایت سے زیادہ استحقاق بخشا ہے۔ شادی سے پہلے ان کے تمام تر مصارف کی ذمہ داری باپ پر اور شادی کے بعد شوہر پر ہے۔

جہاں مرد کی معاشی ذمہ داریاں کم ہوں وہاں اسلام نے عورت مرد کے درمیان فرق نہیں کیا۔ معاش یا معاشی حیثیت میں مضبوطی تمدنی زندگی میں نہایت اہم ہے جس کی وجہ سے معاشرے میں انسان کی قدر و منزلت برقرار رہتی ہے۔ اسلام نے اس حیثیت میں بھی عورتوں کو وسیع حقوق دیے ہیں۔ وہ حصولِ معاش کے لیے کام کر سکتی ہیں، تجارت کر سکتی ہیں، اپنی صلاحیتوں کا استعمال کر سکتی ہیں۔ بوقتِ ضرورت گھروں سے باہر نکل سکتی ہیں حتیٰ کہ ایک عدت میں بیٹھی ہوئی عورت بھی ضرورت پڑنے پر کام کرنے جا سکتی ہے۔

تاریخ سے واقف کوئی بھی شخص اس بات سے انکار نہیں کرے گا کہ عورتوں نے دین و دنیا کے ہر میدان میں اپنی اعلیٰ قابلیت کے جوہر دکھائے ہیں۔ پرانی تہذیبوں میں بھی خواتین جنگوں میں شرکت کرتی تھیں۔ لڑائی میں حصہ لیتی تھیں۔ عرب میں عورتیں رجزیہ اشعار پڑھ پڑھ کر اپنے مردوں کا حوصلہ بڑھاتیں

اور بعض اوقات ہاری ہوئی جنگ اسی لیے جیت لی جاتی۔ جنگ کے دوران زخمیوں کو پانی پلاتیں اور اس کے بعد زخمی فوجیوں کی تیمار داری کرتیں۔ انہیں پرانی فتح کی یاد دلا کر نئی جنگ کے لیے تیار کرتیں۔

قرآن نے تو عورت کو کم تر حیثیت نہیں دی مگر پھر بھی بعد کے مسلم معاشروں میں عورت کے حقوق کو سلب کر لیا گیا۔ ان معاشروں میں عورت کو وہ مقام نہیں ملا جو اس کا جائز حق تھا۔ عورت کی ملکیت کو متنازعہ کیا گیا اور اسے صرف گھروں تک محدود رہنے پر مجبور کر دیا گیا۔

سابق وزیر اعظم پاکستان بے نظیر بھٹو نے اپنے ایک لیکچر 'سیاست اور مسلمان عورت' میں کہا ہے:

> رسول ﷺ کی وفات کے بعد قبائلی رسوم ورواج اور تعصّبات نے ایک دفعہ پھر سر اُٹھالیا تھا۔ پاکستان میں قرآن کی تنگ نظری پر مبنی ایسی تشریحات کی گئیں جو بر سرِ اقتدار لوگوں کی سیاسی ضروریات کو پورا کرتی تھیں۔[۲۸]

اسلام نے عورت کو معاشرے کے سیاسی، سماجی اور معاشی ڈھانچے میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت دی ہے۔ اسلامی تاریخ میں خواتین محدثہ بھی نظر آتی ہیں اور مردوں کے دوش بدوش فنون وادب، شاعری، فقہ، حدیث، سیاست، تجارت، تبلیغ، میدانِ حرب، طبابت ہر جگہ پر اپنے کارہائے نمایاں کے ساتھ موجود ہیں۔ اسلام عورت کے وجود اور اس کی انفرادیت کو نہ صرف تسلیم کرتا ہے بلکہ اس کی اہمیت پر اس قدر زور دیتا ہے کہ اس کے وجود کے بغیر تمام مادی یا روحانی ترقی کو نامکمل قرار دیتا ہے۔ عورت بھی مرد کی مانند راہِ سلوک کی منزل کی مسافر بن کر روحانی درجات پر فائز ہو سکتی ہے۔ اپنے وقت کی ولی بن سکتی ہے۔ بھٹکے ہوؤں کو راستہ دکھا سکتی ہے۔ بلند سے بلند تر مقام ومرتبہ حاصل کر سکتی ہے۔ اسلام نے محض عورت ہونے کے باعث اس پر ناروا اور بے جا پابندیاں عائد نہیں کیں۔ جس طرح مردوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ پورے خلوص دل اور ایمانداری کے ساتھ اپنی ذمہ داریاں ادا کریں اسی طرح وہ تمام شعبے جو خواتین کی زیرِ نگرانی ہوتے ہیں۔

مثلاً خواتین کے تعلیمی ادارے، ہسپتال، پولیس یا فوجی تربیت کے ادارے، ان کو چلانے میں خواتین پوری طرح ذمہ دار اور خود مختار ہیں۔ جو عورتیں اپنی ذہانت اور قابلیت کی بنا پر کسی مخصوص علم وفن یا شعبہء

زندگی کے معاملات میں مہارت اور ہنر مندی کا مظاہرہ کریں ان کو آگے بڑھنے کا مکمل اختیار حاصل ہے۔ جدید قوانین نے مرد وزن کی مساوات اور عزت و تکریم کا جو تصور اس زمانے میں پیش کیا ہے در حقیقت وہ اسلام کی روح کا حصہ ہے۔ قرآن میں عورت کے وجود کو باقاعدہ تسلیم کیا گیا ہے نہ صرف یہ بلکہ اس کی اہمیت اس قدر زور دیا گیا ہے کہ اس کے تمام حقوق بحیثیت ایک ماں، بہن، بیٹی، اور بیوی کے اسے دینے کے لیے مکمل قوانین بنائے گئے ہیں۔ قرآن سے ثابت ہے کہ عورت کے وجود کے بغیر تمام روحانی ومادی ترقی بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے۔

افضل الرحمٰن کہتے ہیں:

> موجودہ معاشرے میں ایک مسلمان عورت کا ہر عمل اور ہر سرگرمی عبادت ہے بشرطیکہ وہ کام اللہ کی رضا طلبی کے لیے کیا جائے۔ یہاں تک کہ بچے کی نگہداشت اور پرورش کرنا بھی اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کی روحانی ترقی کا موجب ہے، اس کی مادرانہ محبت اور معاشی خوشی بھی عورت کے مقام کو بلند کرتی ہے، دوسرے الفاظ میں اس کی عبادت اور بحیثیت بیوی اپنے فرائض کی ادائیگی جس میں اللہ کی رضا چاہنے کا ارادہ ہو یہ سب چیزیں اس کی روحانیت میں اضافہ اور قرب الٰہی کا سبب بنتی ہیں۔[۲۹]

غرض یہ کہ اسلام مرد اور عورت دونوں کے لیے برابر کے احترام اور اہمیت کی بات کرتا ہے۔ کیونکہ اسلام کا بنیادی نظریہ انسانیت کے لیے ہے۔ اسلام کی نظر میں سب انسان برابر ہیں۔ جہاں گورے کو کالے پر، عربی کو عجمی پر کوئی فوقیت حاصل نہیں ہے، وہیں مرد اور عورت کے لیے بھی کوئی تخصیص نہیں۔ اپنے اپنے میدان میں ان دونوں اصناف کے حقوق و فرائض طے کر دیے گئے ہیں اور بار بار تاکید کی گئی ہے کہ معاشرے میں توازن رکھنے اور کسی بگاڑ سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ مرد اور عورت اپنی ذمہ داریاں احسن طریقے سے ادا کریں، باہمی احترام کو ملحوظ رکھیں اور صرف صنفی بنیاد پر امتیاز پیدا نہ ہونے دیں تاکہ ایک بہتر اور کار آمد معاشرے کا حصہ بن کر ملک و قوم کی فلاح و بہبود میں اپنا حصہ ڈال سکیں۔

۲) مغرب میں تانیثیت:

سولہویں صدی عیسویں یورپ میں عورتوں کو کوئی سماجی مرتبہ نہیں ملا تھا۔ ان کی سماج میں کوئی حیثیت نہ تھی۔ تمام تر مراعات کے حقدار صرف اور صرف مرد تھے۔ عورت تعلیم حاصل کر سکتی تھی اور نہ ہی آزادی سے اپنی ہی زندگی کی چند گھڑیاں گزار سکتی تھی۔ اسے ایک ناپسندیدہ ہستی گردانا جاتا۔ اسے مختلف القابات سے نوازا جاتا تھا۔ کبھی جادوگرنی کہا جاتا کبھی چڑیل کہیں گمراہ کرنے والی اور کہیں شیطان کی بیٹی۔ اسے وارثت سے محروم رکھا گیا۔ ہر طرح کی معاشرتی و معاشی آزادی سے محروم رکھا گیا۔ انگلستان کے قانون کی رو سے یہ بات طے تھی کہ عورت کا جو بھی مال و جائیداد ہو گی، وہ مرد کی زیرِ نگرانی ہو گی۔ عورت کے لیے نان و نفقہ کے مناسب بندوبست کا بھی کوئی مناسب قانون نہیں تھا۔

عبدالقیوم ندوی، اسلام اور عورت میں لکھتے ہیں:

> یورپ اس وقت مساوات مرد و زن کا سب سے بڑا دعوے دار ہے۔ لیکن اسی یورپ میں ایک صدی سے کچھ پہلے عورت مرد کے ظلم و ستم کا نشانہ بنی ہوئی تھی، آج بھی مغرب کی تمام تر ترقیوں کے باوجود شادی کے بعد عورت اپنے تمام حقوق ملکیت کھو بیٹھتی ہے، اور اپنا خاندانی نام تک باقی نہیں رکھ سکتی، بلکہ شوہر کے نام سے پکاری جاتی ہے۔[۳۰]

جب تک یورپ نشاۃ ثانیہ کے عہد تک نہ آیا مجموعی طور پر یہی صورت حال رہی۔ اس عہد کے مطالعے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت کی عورت وہیں کھڑی تھی جہاں برصغیر کی عورت تھی۔ ان دونوں کی سماجی حیثیت میں زیادہ فرق نہ تھا، بلکہ بعض صورتوں میں برِصغیر کی عورت زیادہ فعال دکھائی دیتی ہے۔ یورپی سماج میں عورت کی محکومیت کی کہانی کئی صدیوں پر محیط ہے۔ یہودیت اور عیسائیت میں اگر مذہبی حوالوں سے عورت کو کچھ حقوق حاصل تھے تو بھی اہل یورپ اس سے روگردانی کرتے تھے۔ عورتوں کو اتنا بھی حق حاصل نہ تھا کہ اپنے نام سے یا اپنی خاطر ضروریات زندگی خرید سکے یا منگوا بھیجے۔ عیسائی پادری اور مشنری اپنے

مذہب کی تبلیغ اور فروغ کے لیے یورپ اور دور دراز خطوں کے سفر کرتے تھے اور دنیا بھر کو اپنے مزاج اور وسیع النظری سے متاثر کرنے کی کوشش کرتے مگر اُن کے اپنے قوانین اور معاشرے میں عورت کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ عورت کو بدی کا استعارہ قرار دیا گیا لہذا وہ اپنی ذات میں خود شرمندہ رہنے لگی۔ چرچ نے عورت کو سماجی سطح پر اس قدر محدود کر دیا کہ وہ کسی بھی نوعیت کی سماجی سرگرمی میں حصہ لینے کے قابل نہ رہی۔ اسے اپنے حقوق کے بارے میں تفکر کے لائق ہی نہ چھوڑا گیا۔ اگر شادی شدہ عورتوں پر ان کے شوہر جبر کرتے، ظلم کرتے اور ان کو مارتے پیٹتے تو ایسے شوہروں کی تادیب کا کوئی انتظام نہ تھا الٹا عورت کو ہی موردِ الزام ٹھہرایا جاتا تھا۔

افتخار شیروانی "عورت کی محکومیت" میں لکھتے ہیں:

> سولہویں صدی عیسوی تمام دنیا میں غیر معمولی قابلیت کے لوگوں کا زمانہ تھا انگلستان میں ملکہ ایلزبتھ اول اور شیکسپیئر اور ہندوستان میں اکبر اعظم، ترکی میں سلیمان اعظم بادشاہوں، سیاست دانوں، ادیبوں کی ایک مرعوب کرنے والی فہرست سامنے آتی ہے۔ لیکن تضاد دیکھیے کہ انگلستان میں ملکہ ایلزبتھ اول کی ہوش مندی اور صلاحیت کا ہر شخص قائل تھا لیکن عام عورتوں کو سیاست میں حصہ لینے کی اجازت تک نہ تھی۔ آکسفورڈ اور کیمبرج میں نئے کالج قائم ہوئے خوشحال کنبوں کے لڑکوں کے لیے پبلک سکول قائم ہوئے۔ ملکہ ایلزبتھ آکسفورڈ اور کیمبرج گئیں اور استادوں اور طلبہ سے خطاب کیا لیکن کوئی کالج یا اسکول لڑکیوں کے لیے قائم نہ ہوا۔[۳۱]

یہ ایک عجیب تضاد دیکھنے میں آتا ہے جہاں طبقہ اشرافیہ میں تو ایک عورت کو بلند ترین سماجی مرتبہ حاصل تھا۔ وہ آزادی کے ساتھ اپنی زندگی کے فیصلے کرتی ہے۔ عیش و عشرت اور تمام سہولیات سے فائدہ اٹھاتی ہے۔ مردوں کے ساتھ برابری کی سطح پر رابطے میں رہتے ہوئے حکومت چلاتی ہے مگر ایک عام عورت اپنے بنیادی حقوق تک سے محروم ہے بلکہ وہ ان کا شعور تک نہیں رکھتی انگلستان کے علاوہ فرانس میں بھی جو اس وقت بھی علم و ادب اور تہذیب و تمدن کا استعارہ سمجھا جاتا تھا، وہاں پر بھی عورتوں کی حیثیت ایک بھیڑ

بکری سے زائد نہ تھی۔ عائلی قوانین نہ ہونے کے برابر تھے۔ عورتوں کو عمومی طور پر تحفظ حاصل نہ تھا۔ اس نظام میں عورت پادری نہیں بن سکتی۔ کوئی مذہبی فیصلہ نہیں لے سکتی۔ قاضی نہیں بن سکتی۔ گواہی نہیں دے سکتی۔ اکیلے دعا بھی نہیں کر سکتی۔ گویا ہر سطح پر عورت تنہائی کا شکار ہے۔

اٹھارویں صدی عیسوی میں یورپ میں علم و دانش کا چرچا عام ہوا۔ فرانس تہذیب و تمدن، شائستگی اور نفاست کی طرف گامزن تھا۔ جب ۱۷۸۹ء میں انقلابِ فرانس آیا تو آزادی اور برابری کے نعرے ہر سُو سنائی دینے لگے۔ ۱۸۸۰ء میں فرانس میں خواتین کی ایک تنظیم قائم ہوئی۔ یوں خواتین کے حقوق کا باقاعدہ اور با ضابطہ آغاز ہوا۔ درحقیقیت تانیثیت کی تحریک سب سے زیادہ زور دار طریقے سے فرانس میں ہی اُبھری اور آج بھی سب سے زیادہ متحرک اور stimulating text فرانس میں ہی لکھے جا رہے ہیں۔

سید محمد عقیل "تانیثیت ایک تنقیدی تھیوری" میں لکھتے ہیں:

> تمام طبقہء نسواں کے دانشور، ادب کے معلمین، فلسفے اور نفسیات کے تانیثی مفکرین جن میں ژولیا کرسٹیوا، ایلی سیز و Hele Cixous ژوائے گوئٹے Xaviere Gauthier اور ماریا آں تونی Maria Antoniette اور سیمون ڈی بوار simone de Beaviour خاص ہیں۔ سیمون نے ہی اس تحریک کو علمی، ادبی اور تنقیدی بلندیوں تک پہنچا دیا۔ یہ تمام تانیثی ادیب خاصے انقلابی Radical ہیں اور مار کسی کلچر کو انہوں نے اپنا قاعدہ یعنی base بنایا ہے۔[۳۲]

یورپ میں آنے والے صنعتی انقلاب کی وجہ سے بھی پورا معاشرہ تغیر و تبدیلی کا شکار ہوا۔ ہر طرف فیکٹریاں اور نئے نئے کارخانے وجود میں آنے لگے تو عورتوں کی حیثیت میں واضح تبدیلی دیکھنے کو ملی۔ کیونکہ صنعتی انقلاب کے بعد عورتوں کو فیکٹریوں میں بڑی تعداد میں کام ملنے لگا اور یوں عورت کے مالی حوالے سے مستحکم ہونے کی صورت واضح ہونے لگی۔ جیسے عورتوں نے کام کرنے کے لیے گھروں سے نکل کر فیکٹریوں میں قدم رکھا ان کی معاشی حالت بہت بہتر ہو گئی۔ کیوں کہ کارخانوں میں کام کی بہت گنجائش تھی اور عورتوں کے لیے مواقع بہت زیادہ تھے۔ لہذا اب عورت چار دیواری میں قید نہ رہی تھی۔ اب وہ اپنی مرضی سے کہیں بھی آ

جاسکتی تھی۔ اپنی مرضی کا کام کر سکتی تھی۔ اس عمل سے عورتوں کو کام کی آزادی کے ساتھ ساتھ جنسی آزادی بھی میسر آئی۔ اپنے حق کے لیے آواز اٹھانی آئی۔ وہ حقوق جن سے وہ صدیوں سے محروم چلی آ رہی تھیں ان کی بازیافت کے لیے عورتوں کی آواز میں ایک نیا دم خم پیدا ہونے لگا۔

عورتوں کی اپنے حقوق کے لیے یہ آواز ۱۸۳۰ء کی دہائی میں ایک باقاعدہ تحریک کی صورت اختیار کر گئی۔ اس کے زیر اثر خواتین نے واضح اور دوٹوک انداز میں اپنے حقوق کی بات کی اور اس تحریک کو سیاسی صورت دی۔ عورتوں نے اپنے حقوق کی خاطر اس قدر جوش و جذبے سے کام لیا کہ مردوں کے لیے ممکن نہ رہا کہ اب وہ انہیں پھر سے گھر کی چار دیواری میں بند کر سکیں۔ عورتوں کی یہ ساری تحریک ان کی غلامی کے خاتمے کی تحریک تھی۔ ۱۸۶۱ء میں غلامی کو خلافِ قانون قرار دیا گیا۔ اس پورے عرصے میں عورتوں کے حقوق کے لیے بہت سی سماجی تنظیمیں قیام میں لائی گئیں۔ سرمایہ دارنہ نظام نے یورپ کے عمومی معاشرے پر کیا اثر ڈالا اس کی تعریف J.L. Hansan نے اس طرح کی

> سرمایہ داری ایسا سیاسی اور معاشی نظام ہے جس میں کہ ذاتی ملکیت کا حق حاصل ہوتا ہے اور جس میں لوگوں کو یہ آزادی ہوتی ہے کہ وہ طلب اور رسد کے مطابق پیداوار مہیا کریں۔ [۳۳]

پہلی جنگِ عظیم میں یورپ اور امریکہ کے لاکھوں مرد مارے گئے اور اپنے پیچھے لاکھوں عورتیں چھوڑ گئے۔ جنہیں انتہائی مشکلات سے دوچار ہونا پڑا۔ ان کا نہ کوئی سہارا تھا نہ کوئی کما کر دینے والا تھا لہذا عورتوں کو اپنے اور اپنے گھر والوں، بچوں کا پیٹ پالنے کے لیے اپنے بل پر گھر سے نکلنا پڑا۔

محمد قطب "اسلام اور جدید ذہن کے شبہات" میں لکھتے ہیں:

> جنگ کی وجہ سے مردوں کی تعداد میں جو خلا پیدا ہو گیا تھا اس کو بھرنا زندہ رہنے والوں کی بس کی بات نہ تھی۔ مزدوروں اور کارکنوں کی کمی کے باعث کارخانوں کے کام پر بہت برا اثر پڑا جس کی وجہ سے جنگ کے نقصانات کی تلافی ناممکن ہو گئی، اس لیے عورتوں کو مجبوراً گھروں سے نکل کر مردوں کی جگہ لینی پڑی۔ [۳۴]

دھیرے دھیرے سے یہ سلسلہ آگے بڑھنے لگا اور کارخانوں میں مرد اور عورت اکٹھے کام کرنے لگے اور مل جل کر ایک جگہ رہنے سے دیگر مسائل بھی سر اٹھانے لگے۔ نسوانیت، جنسی رابطے، عزت و عصمت کے نئے نظریے وجود میں آنے لگے۔ بڑے پیمانے پر نظریات میں تبدیلی کا عمل شروع ہو گیا۔

سید قطب "اسلام کا عدل" میں کہتے ہیں:

> ان نظریات میں ایک نظریہ مساواتِ مرد وزن کا بھی تھا۔ اس نظریۂ مساوات نے چونکہ عورت کو خاندانی قوانین سے بالکل آزاد قرار دیا اور اس کا ولی اور نگران نہ رہا اس لیے وہ نشے میں بہک کر وقت کی لہروں میں بہہ نکلی عورت نے اگر مساوات کا مطالبہ کیا تو اس کا مطلب اجرتوں میں مساوات کا مطالبہ تھا۔[۳۵]

مردانہ معاشرہ ابھی تک عورت کی آزادی کے تصورات کو ہضم کرنے کے عمل میں مصروف تھا۔ لہذا وہ اپنے فائدے اور عورت کے متعلق پرانے خیالات کے پیش نظر ان کو اجرتوں میں برابر کا حصہ نہ دیتے تھے۔ اپنے فرائض پر پردہ ڈالنے کی خاطر عورت کو اپنی کفالت خود کرنے کے ساتھ ساتھ مساوی حقوق دینے کے روادار نہ تھے۔

امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

> مغرب میں مساوات کا تصور یہ ہے قدرت نے جن قوتوں اور قابلیتوں سے مرد کو مسلح کیا ہے بعنیہہ انہی قوتوں اور قابلیتوں سے عورت کو مسلح کیا ہے۔ اور مرد جو کچھ کر سکتا ہے عورت بھی کر سکتی ہے۔ اس لیے مرد اور عورت کی جدوجہد کا دائرہ ایک ہونا چاہیئے۔[۳۶]

یورپ نے عورت کو مرد کے مقابلے میں جو آزادی دی تھی وہ بظاہر آزادی تھی، حقیقی آزادی نہ تھی۔ اس آزادیء مساوات کا مطلب یہ تھا کہ عورت کام بھی کرے، نوکری پر بھی جائے، بھاری بوجھ بھی اُٹھائے، بچے بھی سنبھالے، مردوں کی عیاشی کا سامان بھی مہیا کرے اور مرد اس پر اپنا ایک روپیہ بھی خرچ نہ کریں۔

Jacob Young کا کہنا ہے:

مسائل میں ایک بڑا مسئلہ جو روسی خواتین کو درپیش ہے، دوہرے بوجھ کا ہے۔ مکمل وقت ملازمت میں صرف کرنا اور گھریلو ذمہ داریوں کا نبھانا ہے۔ بہت سی خواتین ایک مخصوص انداز میں دن کا آغاز کرتی ہیں۔ صبح اُٹھ کر دفتر کے لیے بس میں سوار ہونا اور اس میں یہ بھی شامل ہے کہ ضروریاتِ زندگی کے لیے دوپہر کے کھانے کے وقت لمبی لمبی لائنوں میں کھڑیر ہیں۔ کام کے خاتمے پر انہیں مزید خرید و فروخت کرنی ہوتی ہے۔ چند خاوندان مشکلات میں ان کی تھوڑی سی مدد کرتے ہیں۔ روسی حکومت کی ایک رپورٹ سے ظاہر ہوتا ہے کہ بیوی ہفتے میں ۳۲ گھنٹے کام میں مصروف رہتی ہے جبکہ خاوند ۶ گھنٹے۔[۳۷]

۱۸۷۰ء میں آکسفورڈ اور کیمبرج میں خواتین کے لیئے درسگاہوں کا قیام عمل میں آیا۔ اسی برس فرانس میں خواتین کی ایک تنظیم قائم ہوئی۔ ۱۹۱۸ء میں ایک قانون کے ذریعے خواتین کو ووٹ کا حق تفویض ہوا۔ عورتوں کی اپنے حقوق کے لیے ایک طویل اور پر استقلال تحریک بالآخر رنگ لائی۔

افتخار شیروانی لکھتے ہیں:

اس بڑے ہجوم میں جو فرانس کے بادشاہ اور ملکہ کو ان کے محل سے نکال کر پیرس لایا تھا، اکثریت عورتوں کی تھی۔ عورتوں کو ووٹ دینے کا حق بھی نہ مل سکا۔ انقلاب کے بعد جب مجلس کے جلسے شروع ہوئے تو ایک شریف رکن نے تجویز پیش کی عورتوں کو ووٹ کا حق ضرور ملنا چاہیے۔ اس پر ایک ستم ظریف رکن نے جواب دیا کہ کیا اس ملک میں کوئی نیک بیوی ایسی ہے جس میں یہ کہنے کہ ہمت ہو کہ اس کی خواہش وہ نہیں ہے جو اس کے خاوند کی ہے۔[۳۸]

آج جب مغرب میں خواتین کو برابری کے حقوق دینے، زندگی کی دوڑ میں ساتھ ساتھ دوڑنے بلکہ بعض اوقات آگے نکل جانے، مساوات کے اصولوں کے تحت بوجھ آدھا آدھا بانٹنے کے نظریات اور تہذیب پر بات ہوتی ہے تو بہت سے لوگ اخلاقی نکتہ ء نظر بھی رکھتے ہیں۔

مغرب میں بھی بہت سے دانش وروں اور مصنفین نے عورت اور مرد کے نعرہء مساوات کو جنسی آوارگی اور اخلاقی پستی سے منسوب کیا۔ ان کے مطابق عورت کے اپنے مقام سے ہٹتے ہی سارا اجتماعی اور سیاسی ڈھانچہ انتشار کا شکار ہو جائے گا۔ خاندان تباہ ہو جائیں گے۔ معاشرہ برباد ہو جائے گا۔ بچے اپنے ماں باپ کو شناخت نہ کر پائیں گے۔ آنے والی نسلوں میں شرافت اور نجابت کے جوہر ڈھونڈنے سے بھی نہ ملیں گے۔ ان کے خیال میں مغربی معاشروں میں جو مساوات کا نعرہ بلند ہوا ہے، وہ بالکل کھوکھلا ہے۔ عورت آج بھی ان ہی مسائل کا شکار ہے جس میں وہ ہمیشہ مبتلا رہی ہے۔ آزادی اور مساوات کے نام پر در حقیقت ان کے ساتھ دھوکہ کیا گیا ہے۔ مردوں نے اپنا سارا بوجھ ان پر منتقل کر دیا ہے اور ان سے ان کا نسوانی حق چھین لیا ہے لہذا آج کی عورت پہلے سے کہیں زیادہ مظلوم اور قابلِ رحم ہے۔

۳) برصغیر میں تانیثیت:

برِصغیر میں تانیثیت کے ابتدائی دورِ ارتقاء کا جائزہ لینے کے لیے ہمیں تاریخ میں جھانکنا پڑے گا۔ اور تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ ہماری تاریخ میں عورت کا وجود تو ہے مگر اس کا وجود وہ ہے جو مرد نے تشکیل دیا ہے۔ کیونکہ ہماری پوری تاریخ صرف مرد کی تاریخ ہے، عورت کی نہیں۔ اس تاریخ کو لکھنے کے لیے جو خاکہ مرتب کیا گیا ہے اس میں عورت کے وجود کی کوئی گنجائش رکھی ہی نہیں گئی۔ اگر عورت کہیں نظر آتی ہے تو اس کا کردار مرد کے تابع ہوتا ہے۔ مثلاً یونانی مورخوں نے جنگ کو تاریخ کا اہم موضوع بنایا اس لیے جنگ کے موضوع میں مردوں کی بہادری، شجاعت اور دلیری کے کارنامے ابھر کر سامنے آئے اور جنگ اس قدر مقدس بن گئی کہ اس کے مقابلہ میں امن پسندی، بزدلی اور کم ہمتی قرار پائی اور اگر کر کسی نے جنگ سے گریز کرنے کی کوشش کی تو اس پر زنانہ پن کے طعنے کسے گئے۔

اس لیے تاریخ کی تعبیر و تشکیل کے لیے یہ نظریہ طے ہوا کہ ہر عظیم کام صرف مرد ہی کر سکتے ہیں۔ اگر ان کا وجود نہ ہو تو تاریخی عمل آگے کی طرف نہیں بڑھ سکتا۔ فاتحین سے لے کر پیغمبروں اور اولیاء اللہ تک مرد ہی مرد نظر آتے ہیں۔

حقوقِ نسواں کی ایک جرمن کارکن خاتون نے کہا تھا کہ

میری تاریخ کی کتابیں جھوٹ بولتی ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ میرا وجود ہی نہیں تھا۔[۳۹]

ہمارے ہاں عورت کا کچھ ایسا امیج بنا دیا گیا ہے جس سے کبھی نفرت محسوس ہوتی ہے، کبھی رحم کھانے کا دل چاہتا ہے اور کبھی نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ جب کوئی اس تاریخ میں عورت کا وجود تلاش کرتا ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے اس خطے میں عورت کو صرف ایک ملکیت کی طرح برتا گیا۔ اسے گائے اور بھیڑ بکری سے زیادہ اہمیت نہیں دی گئی جن کو انسان صرف اس لیے پال لیتا ہے تاکہ ان سے فائدہ اٹھا سکے، مگر اس سے زیادہ اہمیت دینے کے لئے تیار نہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ابتدائی دور میں جب قبیلوں میں باہمی جنگ و جدل ہوتا تھا اور جنگ بندی کے لیے دوستی کے معاہدے کیے جاتے تھے تو اس میں باہمی شادی بیاہ کے ذریعے تعلقات کو بہتر بنایا جاتا تھا۔ آہستہ آہستہ یہ رواج بن گیا کہ جب بھی مخالفوں اور دشمنوں سے دوستی کی ضرورت پڑے گی انہیں اپنی لڑکی دے کر دوستی کر لی جاتی تھی۔ اس طرح کی شادیوں سے بے پناہ ثمرات اٹھائے جاتے۔ سیاسی تعلقات بہتر ہو جاتے اور شکست خوردہ حکمران کے قبیلے پر برتری ثابت ہو جاتی۔ ہر دو صورتوں میں صرف عورت کو قربانی کا بکرا بنا دیا جاتا اور ان کی زندگی اور خوشی کی قیمت پر اپنی زندگی کو آسان بنا لیا جاتا تھا۔

تاریخ اس قسم کی شادیوں سے بھری پڑی ہے۔ مثلاً جب بابر سمرقند میں تھا تو اس کے جانی دشمن شیبانی خان نے سمرقند کا محاصرہ کر لیا اور جب بابر کے لیے کوئی امید نہ رہی تو اس نے اپنی بہن خانزادہ بیگم کو شادی کے لیے شیبانی خان کے حوالے کیا اور خود وہاں سے فرار ہو گیا۔ راجپوت حکمرانوں نے اکبر کو اپنی لڑکیاں پیش کیں تاکہ وہ شادی کر کے مغل خاندان کا حصہ بن جائیں۔

ڈاکٹر مبارک علی اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

> اس سارے عمل کا المیہ یہ تھا کہ عورت قربانی کے بعد گم نام ہو جاتی تھی اور اس کا کردار اس کے بعد ختم ہو جاتا تھا۔ اس کی قربانی کے نتیجہ میں جو فوائد ہوتے تھے وہ تمام مردوں کو ملتے تھے۔ اور ان قربانیوں کے بعد بھی عورت کا سماجی رتبہ بڑھا نہیں بلکہ اس سے مردوں کو حوصلہ افزائی ہوئی کہ وہ اپنے مقاصد کے لیے عورت کو

استعمال کریں۔ چنانچہ ہماری تاریخ چاہے یورپ کی ہو یا ایشیاء و افریقہ کی اس میں
عورت مرد کے مفادات کے لیے استعمال ہوتی ہے۔[۴۰]

جنگوں کے بعد جب مالِ غنیمت جمع کیا جاتا تھا تو اس مالِ غنیمت کا اہم حصہ عورتیں ہوا کرتی تھیں۔ جنگی قیدی بننے سے پہلے اگر ان کی کوئی سماجی حیثیت ہوتی بھی تو اس کے بعد فوری طور پر ختم ہو جاتی تھی اور اس کا درجہ لونڈی اور کنیز کا ہو جاتا تھا۔ اور اس کے مالک کو اس پر پورا پورا حق ہوتا تھا کہ چاہے تو وہ اسے اپنے استعمال میں رکھے اور چاہے کسی کو تحفے میں دے دے۔ جنگ کے بعد فتح کی خوش خبری میں سب سے بڑی خبر یہ ہوتی تھی کہ کتنی عورتیں قبضے میں آئی ہیں۔ مثلاً چچ نامہ میں ہے کہ سندھ کی فتح میں صرف ایک شہر سے فاتح محمد بن قاسم نے تیس ہزار غلام اور کنیزیں حاصل کیں جن میں راجاؤں کی بیٹیاں بھی شامل تھیں۔ اس کے بعد ان کا کیا ہوا اس کے بارے میں تاریخ خاموش ہے۔

بعض اوقات شکست کے آثار نظر آتے ہی عورتوں کو اپنی عزت و آبرو پر قربان کر دیا جاتا تھا اور انہیں زبردستی آگ میں کودنے پر مجبور کیا جاتا یا پھر کنویں میں دھکا دے دیا جاتا تھا۔ عورتوں کو ان کی مرضی کے خلاف زندہ درگور کرنے سے مردانگی کی شان بلند کی جاتی اور ان کی عزت و غیرت کے قصیدے پڑھے جاتے تھے۔ پوری تاریخ میں ہمیں عورت کی حیثیت ایک ملکیت اور شے سے زیادہ نظر نہیں آتی۔ خوبصورت عورتوں سے اپنا حرم بھرنے کے شوقین حکمران جب کسی دور دراز خطے میں کسی خوبصورت عورت کی موجودگی کی خبر سنتے تو اس کے حصول کے لئے جنگ چھیڑنے سے بھی گریز نہیں کرتے تھے۔ ٹرائے کی جنگ "ہیلن آف ٹرائے" کے لیے لڑی گئی۔ ہندوستان میں چتوڑ پر علاؤالدین خلجی کی چڑھائی کا باعث بھی ایک رانی پدماوتی کو قرار دیا جاتا ہے۔ یہاں پر ان حکمرانوں کی ہولناکی کو فراموش کر دیا جاتا ہے اور وجہ تنازعہ صرف ان عورتوں کا حسن ٹھہرایا جاتا ہے جن کے لیے ہزاروں بے گناہ لوگوں کو ایک بیکار کی جنگ میں جھونک دیا جاتا ہے اور وسائل کا بے پناہ زیاں بھی کیا گیا۔

تاریخ میں عورت کا ذکر زیادہ تر منفی انداز میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ اگر وہ سلطنت کے کاموں میں اپنے شوہر کی دستِ راست بننے کو کوشش کرتی ہے تو اسے ایک اقتدار کی ہوس رکھنے والی، ملکی سیاست کو تباہ کرنے

والی اور شوہر کو گمراہ کرنے والی عورت بنا دیا جاتا ہے۔ ہندوستانی مورخ ملکہ نور جہاں کو الزام دیتے ہیں کہ وہ جہانگیر پر اس قدر حاوی ہو گئی تھی کہ اس کی وجہ سے مغل سلطنت زوال کا شکار ہونا شروع ہوئی مگر جہانگیر کے اپنے کردار اور مشاغل کو ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جاتا۔

ڈاکٹر مبارک علی اس سلسلے میں کہتے ہیں:

> پوری تاریخ میں جنگ بہادری اور مردانگی کی علامت رہی اور امن پسندی کو عورت سے منسوب کر کے اس کا مذاق اڑایا گیا۔ مگر انسانی تاریخ میں جنگ کی ہولناکیوں کے بعد انسان کا بار بار امن و آشتی کی طرف لوٹنا کیا عورت کی فتح نہیں ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اخلاقی اقدار کے معنی بدلنے میں وقت درکار ہوتا ہے مگر اب بہادری و شجاعت صرف جنگ سے منسوب نہیں رہی ہیں بلکہ ان کا تعلق سماجی بہبود کے کاموں سے بھی ہوتا جا رہا ہے اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ مردوں کی بنائی ہوئی قدریں وقت کے ساتھ کم زور ہو رہی ہیں۔[۴۱]

ماضی کی عورت کئی دوسری حیثیتوں میں بھی سامنے آتی ہے مثال کے طور پر ملکہ اور حکمران کی حیثیت میں ہندوستان میں رضیہ سلطانہ اور چاند بی بی، انگلستان میں الزبتھ، روس میں کیتھرائین اور آسٹریلیا میں تھریسا کچھ مثالیں ہیں۔ مگر یہاں پر ایک اور المیہ نظر آتا ہے کہ ان کی اہمیت اور قدر و منزلت ان کے مصاحبین کی مرہونِ منت دکھائی دیتی ہے جو ان کے ارد گرد رہتے اور ان کو مشورے دیتے نظر آتے ہیں۔ اگر خاتون حکمران کسی وجہ سے ناکام ہو جاتی ہے تو اس صورت میں ساری ذمہ داری اس پر ڈال دی جاتی ہے، کیونکہ وہ عورت تھی، سیاست سے نابلد تھی، عقل سے بے بہرہ تھی لہذا غلط فیصلے کر کے ملک اور قوم کو تباہ کر بیٹھی۔ اسے اقتدار کی بھوکی اور گمراہ عورت کے طور پر یاد کیا جاتا ہے۔

اگر کہیں اس نے کامیابیاں حاصل کر لیں تو یہ نیک نامی اس کے حصے میں نہیں آتی بلکہ یہاں ان سب کامیابیوں کی وجہ وہ عقل مند اور جہان دیدہ وزراء اور مشیر قرار پاتے ہیں جو در پردہ حکومت چلا رہے ہوتے ہیں۔ یعنی بہر صورت عورت کی عقل و شعور پر ایک سوالیہ نشان کھڑا کر دیا جاتا ہے۔ انگلستان کا مشہور مورخ"

ٹوائن بی "اسی بات کا قائل تھا کہ انسان کے شجاعانہ دور میں سب تباہیاں عورت کی وجہ سے آئی ہیں۔ اس نے عورت کو ان تمام خرابیوں کی جڑ قرار دیا جن کی وجہ سے باہمی جنگ و جدل کی نوبت آئی۔

> مورخ قوموں کے زوال میں عورت کو دو حیثیتوں میں دیکھتے ہیں۔ اوّل عورت کی آزادی اور اس کا ملک کے سیاسی معاملات میں دخل، دوم حکمران طبقوں کا عورتوں کی صحبت میں وقت گزارنا۔ ان دونوں صورتوں میں ان کے نزدیک قومیں زوال سے دوچار ہوتی ہیں۔ لہذا جب بھی ملکی معاملات بگڑتے ہیں، مستحکم نظام ٹوٹتا ہے تو اس کی تمام تر ذمہ داری عورت پر ڈال دی جاتی ہے۔[۴۲]

برِ صغیر میں خاص طور پر مسلمانوں میں زیادہ تعداد ان ہندو نژاد لوگوں کی ہے جنہوں نے اسلام قبول کیا۔ ہندوستان کی قدیم روایتیں اور صدیوں کے طور طریقے ہندوستانی مسلمانوں میں رچے بسے ہیں۔ ہندوستان کے قدیم ترین تمدن اور تہذیب سے لے کر آج تک اس خطے میں عورت دیویوں کے روپ میں نظر آتی ہے۔ لیکن اس کی سماجی حیثیت آج بھی مردوں کے زیرِ نگیں ہے۔ پرانے قصے کہانیوں اور دیوتاؤں کے قصوں کو جب کھنگالا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ بیٹی کی حیثیت میں عورت باپ کی ملکیت ہے جسے وہ اس کے شوہر کو دان کر دیتا ہے جسے آج بھی کنیا دان کہتے ہیں۔

پھر عورت شوہر کی ملکیت ہے جسے وہ جوئے میں ہار سکتا ہے جیسے دروپدی کو جوئے میں ہار دیا گیا۔ ہندوستانی عورت کی سب سے بڑی معراج ماں بننا ہے اور اس سے بھی اہم بیٹے کی ماں بننا ہے۔ اگر بیٹا پیدا نہ ہو تو عورت قصوروار ہے۔ اس کی نحوست اور سبز قدمی کی وجہ سے وہ اپنے شوہر کو وارث نہیں دے سکتی۔ ایامِ حیض کے دوران وہ اس قدر منحوس ہے کہ اس کا سایہ بھی کسی پاک چیز پر نہیں پڑنا چاہیئے۔ ہندستانی عورتوں میں اگر کوئی قسمت کی ماری بیوہ ہو جائے تو اس کے لیے سب سے بہتر تو یہ ہی سمجھا جاتا ہے کہ وہ بھی اپنے شوہر کے ساتھ جل مرے لیکن اگر وہ زندہ رہنا چاہتی ہے تو ضروری ہے کہ وہ اپنے اوپر زندگی کی تمام خوشیاں اور نعمتیں حرام کر لے۔ بھول کر بھی دوسری شادی کے باری میں نہ سوچے۔ اس تہذیب میں باپ کی املاک میں بیٹی کا کوئی حصہ نہیں تھا لہذا اس کی شادی کے وقت ہی تمام کھاتے بند کر دیئے جاتے تھے۔

اس حوالے سے فہمیدہ ریاض کا کہنا ہے:

> وہ بنیادی پتھر جو برِ صغیر کے باشندوں کے شعور اور تحت الشعور کی بنیاد میں نصب ہیں۔ ان کی بنیاد پر وسط ایشیائی اور عرب رسوم ورواج کی عمارت بھی کھڑی ہے۔ یہ دونوں ہی عورت کے حق میں زہر ہیں۔ اس فرق سے کارل مارکس کے اس نظریہ کے درست ہونے کے اشارے ملتے ہیں کہ عورت کی کمتر حیثیت کا گہرا تعلق زرعی دور کے آغاز اور باغ، کھیت وغیرہ کے ذاتی ملکیت ہونے سے ہے۔[۴۳]

عورت پر کمتر حیثیت ساری دنیا میں تھوپی گئی لہذا برِ صغیر کا معاشرہ بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے مگر اسلام کی آمد کے بعد برِ صغیر کے مسلم معاشرے میں خاص طور پر عورت کے انسانی وجود کو تسلیم کرنے کے روشن شواہد پائے گئے ہیں۔ ۱۲۱۳ء میں دہلی کے سلطان التمش نے تین بیٹوں کی موجودگی میں اپنی غیر شادی شدہ جواں سال بیٹی رضیہ کو سلطنتِ دہلی کا سلطان نامزد کر دیا۔ کیونکہ اس کے بیٹے نا اہل تھے جبکہ رضیہ سلطنت کے امور اور فنِ حرب میں طاق تھی۔ یعنی رضیہ کا محض عورت ہونا اس اہم فیصلے میں حائل نہ ہوا تھا۔ یہی رضیہ بعد میں رضیہ سلطانہ کہلائی اور بعد ازاں تاریخ میں متنازع بنادی گئی۔ اس کی صلاحیتوں اور قوتِ فیصلہ کی بجائے اس کے کردار کو موضوعِ گفتگو بنایا گیا اور اس کی اہمیت کم کرنے کی کوشش کی گئی۔

مغلیہ دور میں جب مسلمانوں کی تہذیب اپنے عروج پر جا پہنچی تھی تو شہنشاہ بابر کے تمام امور کا انتظام اس کی نانی احسان دولت بیگم کرتی تھیں۔ وہ آخری وقت تک اپنے نواسے کی مشیر رہیں۔

بابر نے ان کے بارے میں لکھا:

> میری نانی بے مثال شخصیت تھیں۔ وہ اتنی دانش مند اور دور اندیش تھیں کہ خاندان بھر میں کوئی ان کا ثانی نہ تھا۔ میرے زیادہ تر معاملات ان ہی کے مشورے سے طے پائے تھے۔[۴۴]

منہاج السراج اور طبقاتِ ناصری کی تاریخ پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے بعض بہت دلچسپ اور فکر انگیز حقائق کا علم ہوتا ہے مثلاً شہنشاہ اکبر نے ۱۵۸۱ء میں اپنے خاندان کی ایک خاتون بدرالنساء بیگم کو کابل کا

گورنر مقرر کیا تھا۔ اکبر ہی کے دور میں ایک خاتون جان بیگم کو تفسیرِ قرآن لکھنے پر پانچ ہزار دینار شہنشاہ ہندوستان کی طرف سے انعام میں دیے گئے۔

شہنشاہ جہانگیر کی ملکہ نور جہاں اپنی پر وقار اور دلکش شخصیت کے باعث شاعروں کا موضوعِ سخن رہی ہیں۔ تاریخی شواہد بتاتے ہیں کہ وہ باقاعدہ جہانگیر کے ساتھ فرماں روائی میں شریک رہی ہیں۔

بابر کی دختر اور ہمایوں کی بہن گلبدن بیگم کا تحریر کردہ ہمایوں نامہ اس دور کی مغل خواتین کی علوم و فنون پر دسترس کا ثبوت ہے۔ شاہجہاں اور ممتاز محل کی بیٹی جہان آرا کا علم و فضل ایک عالم میں شہرت رکھتا ہے۔

فہمیدہ ریاض کہتی ہیں:

> مغل شہزادیوں میں زیب النسا مخفی ایک نامور اور صاحبِ دیوان شاعرہ گزری ہیں۔ ان کی فارسی غزلیات اعلیٰ پائے کی تھیں۔ آج مغرب کی درسگاہوں میں ان کے فارسی کلام کا انگریزی میں ترجمہ کیا جارہا ہے۔[۴۵]

یہاں ہمیں نظر آرہا ہے کہ کم از کم طبقہ ءاشرافیہ میں خواتین کو کچھ نہ کچھ مقام حاصل تھا۔ یہاں تک کے علم و ادب میں دسترس کے علاوہ مغلیہ دور میں دینی صحیفوں کی تفسیر کو بھی خواتین کی ذہانت سے ماوراء تصور نہیں کیا جاتا تھا۔ مغل شہنشاہوں کے کوائف کا مطالعہ کرنے سے ایسی کئی خواتین کے نام سامنے آتے ہیں جن کو باغات، زمینیں، سرائیں اور جاگیریں دی گئیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مغل دور میں عورت کی ذاتی ملکیت کا تصور راسخ تھا۔ وہ امورِ سلطنت میں بھی دلچسپی رکھتی تھیں اور علم حاصل کرنے کی طرف بھی مائل تھیں۔

زاہدہ حنا "زبان کے زخم" میں لکھتی ہیں:

> مغلوں کے دورِ عروج میں بابر کی ماں تغلق نگار بیگم، ہمایوں کی ماں ماہم بیگم، اکبر کی ماں حمیدہ بیگم، اس کی رضاعی ماں ماہم انگہ، جہانگیر کی ماں مریم زمانی اور جودھابائی،

عالمگیر کی ماں ممتاز محل وہ عورتیں تھیں جو کاروبارِ سلطنت میں صائب مشورتے اور بعض حالات میں دخل بھی دیتی تھیں۔ اس عہد کے بادشاہ اور شہنشاہ اور ننگے سر ان کی پیش قدمی کو آتے۔ ان کے حکم پر سرِ تسلیم خم کرتے۔ علمی و ادبی اور مذہبی معاملات میں ان سے مشورے لیتے۔ ان میں سے بعض ایسے بھی تھے جو لشکر اور دربار کی نگاہوں کے سامنے اپنی ماؤں یا بڑی بہنوں کو رہوار پر سوار کراتے ہوئے ان کی قدم بوسی کرتے تھے۔ اس عہد کے بادشاہوں کی بیویاں اور بیٹیاں نور جہاں، بانو بیگم، گلبدن بانو بیگم، جہاں آرا بیگم، روشن آرا بیگم اور زیب النساء مخفی تھیں۔ یہ وہ چند نام ہیں جو برِ صغیر کے سماجی اور سیاسی عروج کے زمانے میں ہمیں مردوں کے دوش بدوش شمشیر چلاتے شعر کہتے، تزک تحریر کرتے، امور سلطنت میں اپنے حکمران رشتوں کی یاوری کرتے نظر آتے ہیں۔ یہ وہ عورتیں ہیں جو جنگ میں حصہ لینے یا سیر و تفریح کے لیے ہندوستان کے طور و عرض میں سفر کرتیں۔ عورتیں افغانسان، ایران اور سرزمینِ عرب کے دور دراز علاقوں میں حج اور زیارت کے لیے جاتی نظر آتی ہیں۔ ہند ایرانی اشرافیہ سے تعلق رکھنے والی یہ عورتیں بادشاہِ وقت اور شہزادوں کے ساتھ علمی بحثیں کرتیں، ادبی معاملات میں انہیں زچ کرتیں، رقص و سرور اور شراب و شباب کی محفلوں میں متانت کے ساتھ شریک ہوتی دکھائی دیتی ہیں۔[۴۶]

یہاں پہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا ہم شاہی خاندانوں کی خواتین کا ذکر کر کے ہندوستانی مسلم معاشرے میں عورت کی حیثیت کا تعین کر سکتے ہیں؟ تو اس سلسلے میں ہمیں یوں دکھائی دیتا ہے کہ عموماً شاہی خاندان اور حاکم جن رسوم و رواج پر کاربند ہوتے ہیں۔ زیریں طبقے اپنی حیثیت کے مطابق انہیں بخوشی اپناتے ہیں لہذا برصغیر کے مسلمانوں کے ان زیریں طبقات میں عورت کی حیثیت اس رتبے اور قبولیت کا عکس رہی ہے جو حاکم اور شاہی طبقات میں مروج تھی۔ اس کی ایک مثال خواتین کی تعلیم ہے جس کے زیادہ مستند اور تاریخی

شواہد ملتے ہیں کہ شہری آبادی میں شرفاء اپنی بیٹیوں کو خانگی مدرسوں کے ذریعے تعلیم دلواتے تھے اور عوام الناس میں بھی لکھنے پڑھنے اور ادبی ذوق کی حامل خواتین مل جاتی تھیں۔

> سترہویں صدی کی تاریخ میں ایک خاتون "تاج" کا نام ملتا ہے جو قرولی کے گاؤں میں رہتی تھیں اور برج بھاشا میں گیت لکھتی تھیں جو اردو اور ہندی دونوں زبانوں کا منبع ہے۔ اس دور میں مقبول صنفِ سخن کے مطابق "کرشنا" کی محبت میں گیت کہتی تھیں۔ مغلیہ دور کی ایک اور شاعرہ شیخ رنگریزن کا تذکرہ بھی موجود ہے جو اس دور کے آخری زمانوں کے مغل حکمراں شاہ معظم کے دربار سے منسلک بتائی گئی ہیں۔ "شیخ رنگریزن" شادی شدہ تھیں اور ان کے شوہر کا نام "عالم" تھا شیخ رنگریزن (عشقیہ شاعری) لکھتی تھیں۔ انہوں نے اپنے شوہر کو "کرشن" تصور کیا تھا۔ ان کے جو بھی گیت لکھ لیے گئے وہ آج بھی "عالم کیلی" کے نام سے گیتوں کے ایک مجموعے کی صورت میں موجود ہیں۔[۴۷]

۴) اُردو شعر و ادب میں تانیثت

عورت کی سماجی اور معاشرتی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ عورت کی ہی بدولت اساطیری داستانوں میں بھی رومانس نظر آتا ہے۔ مذاہب میں عورت تقدس و حرمت کی دیوی قرار پائی تو شاعری میں حسن و محبت کا محور۔

برصغیر کے قدیم اُردو شعراء نے اپنے عہد کی عورت کو یا تو دیوی، مریم اور پاکیزگی کی مُورت کہا یا پھر اسے ایک طوائف کا روپ دے کر راندۂ درگاہ قرار دے دیا۔ اس عہد کی عورت یا تو غم کی تصویر نظر آتی ہے یا منتقم مزاج بن کر لوگوں پر بجلی گراتی دکھائی دیتی ہے۔

ڈاکٹر سلیم اختر اس حوالے سے لکھتے ہیں:

> معاشرے کی نیک پروین سے یہ توقع رکھی جاتی ہے کہ وہ مرد کے لیے محبوبہ سے باندی تک ہر کردار خوشی خوشی اور خوش اسلوبی سے ادا کرنے کی صلاحیت سے بہرہ

ور ہو اس مقصد کے لیے اسے رشتوں کے غیر مرئی زیورات پہنائے جاتے ہیں۔ وہ
ماں، بہن، بیٹی، بیوی جو کچھ بھی ہو ہمیشہ مردانہ خواہشات کے تابع ہوتی ہے[۴۸]

مگر جیسے جیسے ادب اپنے ارتقائی سفر کی طرف گامزن ہوا، ویسے ویسے معاشرتی تہذیب و ثقافت کی تبدیلیوں نے اس پر اپنے اثرات مرتب کیے۔ اگرچہ برصغیر کے سماجی نظام میں یہ گنجائش کم تھی کہ خواتین تخلیقی صلاحیتوں کے بھرپور اظہار کریں پھر بھی خواتین نے جو ادب تخلیق کیا اسے نظر انداز کرنا ممکن نہیں ہے۔

ابتدائی شاعرات میں ہمیں ماہ لقا چندا، دختر میر تقی میرؔ اور شمس النسا بیگم جیسے نام دکھائی دیتے ہیں یہ وہ خواتین ہیں جنہوں نے پہلی بار مردانہ نام کا سہارا لیے بغیر شاعری کی۔ پچھلی صدی کی ابتدا میں خواتین نے تعلیمی اور تخلیقی سرگرمیوں میں باقاعدہ حصہ لینا شروع کیا۔ اگرچہ سر سید احمد خان کا ہفت روزہ تہذیب الاخلاق عورتوں کی تعلیم اور یبوست زدہ مسلم معاشرہ میں انہیں جائز مقام دلانے کے لیے کوشش کر رہا تھا لیکن یہ پرچہ بطور خاص عورتوں کے لیے مخصوص نہ تھا۔ لاہور سے امتیاز علی تاج کی والدہ محمدی بیگم نے خواتین کے لیے "تہذیب نسواں" جاری کیا۔ جس نے اسی زمانے کی پڑھی لکھی خواتین میں خاص مقبولیت حاصل کر لی۔

۱۹۰۴ میں علی گڑھ سے ماہانہ "خاتون" جاری ہوا۔ ۱۹۰۸ء میں رسالہ "عصمت" کے اجرا کے بعد لکھنے والی خواتین اُردو ادب میں باضابطہ طور پر داخل ہوئیں۔ یہ رسائل وہ معتبر حوالے ہیں جس سے اس ابتدائی دور کی خواتین کی تخلیقات اور ان کی فکر و شعور کا پتہ چلتا ہے۔ ان لکھنے والیوں میں نذر سجاد حیدر، صغریٰ ہمایوں، فاطمہ بیگم، بیگم اختر سہروری، شائستہ اکرام اللہ اور شاعرات میں ز۔ خ۔ ش (زاہدہ خاتون شیروانیہ) صفیہ شمیم، رابعہ پنہاں اور بلقیس جمال جیسی شاعرات شامل ہیں۔

اس عہد میں چونکہ شاعرات کی تعداد بہت کم تھی لہذا ان کے نام اور کام کی طرف بہت کم توجہ دی گئی۔ تعلیم کا نہ ہونا، پردے کی سختی اور سماج میں بے مقام ہونا بنیادی وجوہ ہیں۔

بعض خواتین نے "غیروں پہ کھل نہ جائے کہیں راز دیکھنا" کے مصداق حقیقی نام کے مخففات استعمال کیے ہیں جیسے ن۔ب۔ صاحبہ، ج بیگم اختر، کے الیف خاتون، ج۔ن۔ وفا وغیرہ۔

ان میں ز۔خ۔ش۔ اردو شاعری کا بہت اہم نام ہیں۔ یہ پہلی شاعرہ ہیں جن کی توانا فکر اور طرز کلام کو نظر انداز کرنا ممکن نہیں رہا۔ وہ ایک باشعور اور تعلیم یافتہ شاعرہ تھیں۔ وہ تمام عمر اس بات پر نالاں رہیں اور اس کا اظہار کرتی رہیں کہ عورت پر ترقی کی راہیں بند کر دی گئی ہیں خود انہیں اسی سیاسی اور سماجی نظریات کی مکمل آزادی نہیں تھی۔ انہوں نے اپنی نظموں میں عورتوں کی زبوں حالی کا جو نقشہ کھینچا ہے۔ بڑا ہی پُر تاثیر ہے۔

ڈاکٹر کہتے ہیں، در کھولو، ہوا آنے دو
سنگدل کہتے ہیں، ہرگز نہیں، مرجانے دو
ان کو رہ رہ کر ستاتا ہے یہ بے اصلِ خیال
گھر میں پڑھ لکھ کر خواتین کا رُکنا ہے محال
کہیں اٹھے نہ مساوات کا غم خیز خیال
کہیں ہو جائے نہ مردوں کی حکومت کا زوال[۴۹]

یا پھر

عورتوں کے حق میں ہر مذہب کا ہر ملت کا فرد
جانور تھا۔ دیو تھا۔ عفریت تھا۔ شیطان تھا
باپ ہو، بھائی ہو۔ شوہر ہو کہ وہ فرزند ہو
مرد کل اشکال میں فرعونِ بے ساماں تھا[۵۰]

رابعہ پنہاں اور بلقیس جمال دونوں بہنیں شاعرات ہیں جن کی شاعری میں نسائی اظہار اور نسائی شعور نمایاں ہیں۔

ہے تضادِ زندگی تیرا معمائے عجیب
چشم ظاہر بیں پہنچ سکتی نہیں تیرے قریب[۵۱]

محمد جمیل بریلوی کا مرتب کردہ تذکرہ شاعرات ۱۹۴۴ء میں بریلی کے قومی کتب خانہ سے شائع ہوا جس میں ۲۱۹ شاعرات کے کوائف اور کلام کو جمع کیا گیا۔ یہ وہ شاعرات ہیں جنھوں نے آنے والی خواتین کے لیے راستہ ہموار کیا اور اسی محدود حیثیت میں ہی سہی اپنی تخلیقی مساعی سے مستقبل کی شاعرات کے راہ کے کانٹے چنے اور جادۂ سخن ہموار کیا۔

پاکستان بننے کے بعد خواتین کو لکھنے کے لیے سازگار ماحول ملا اور خواتین کو مساوی حقوق دینے کی جو تحریک ترقی پسند تحریک کے ساتھ چلی تھی اس کے اثرات برصغیر میں نمایاں ہونے شروع ہوئے۔ اس تحریک کے ذریعہ سے معقول تعداد میں خواتین قلم کاروں کو تخلیقی صلاحتیں اجاگر کرنے اور خود کو تسلیم کروانے کے مواقع ملے۔ بہت سی خواتین نے اپنے نام سے شاعری کرنا شروع کی اور آج کی شاعرات کے شعری قافلہ کے لیے ہراول دستہ کا کام کیا۔

پہلی خاتون شاعرہ جو شاعری کے افق پر پہلا معتبر اور مستند حوالہ بن کر ابھریں وہ ادا آجعفری ہیں۔ پروین شاکر نے اپنے ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ "میرے راستے کے کانٹے ادا آجعفری کے چنے" ادا آجعفری کی شاعری میں روایت کا شعور اور نئے طرز احساس کا ایک ایسا امتزاج ملتا ہے جس نے انہیں ہم عصر کہنے والوں میں ممتاز کیا۔ ضمیر جعفری اور حمایت علی شاعر نے ادا آجعفری کو جدید اردو شاعری کی خاتون اول کہا ہے۔

۱۹۵۰ میں ادا جعفری کا اولین شعری مجموعہ "میں ساز ڈھونڈتی رہی" شائع ہوا جس کے پیش لفظ میں ادا آیوں لکھتی ہیں:

زندگی ترے ہے خواب سہی، گیت سہی
نقرئی گیتوں کی زرکار سجیلی کرنیں
نور برساتی رہیں ترے شبستانوں میں
زندگی ٹھوکریں کھاتی رہی طوفانوں میں

اپنی روندی ہوئی ٹھکرائی ہوئی راہوں میں
کتنی نوخیز امیدوں کے سجیلے سپنے
چند دانوں کے عوض بکتے رہے بکتے رہے
بربریت کے ستم سہتے رہے سہتے رہے
زندگی میرے لیے خواب نہ تھی گیت نہ تھی[۵۲]

ادا جعفری پہلی شاعرہ ہیں جنہوں نے نسائی ادب کو معنی خیز بنایا انہوں نے ترقی پسندانہ فکر پر مبنی جو شاعرانہ مسلک اپنایا۔ عمر بھر وہ استقامت اور پوری دیانت داری سے اس پر کاربند رہیں۔ بلکہ بڑھتی عمر، مشاہدات اور تجربات نے وقت کے ساتھ ساتھ پختہ فنی شعور پیدا کیا اور وہ ایک رجحان ساز شاعرہ کہلائیں۔

نسائی ادب کے حوالے سے فہمیدہ ریاض کی شاعری بھی ایک نئے طرز احساس کی جانب سفر کرتی نظر آئی ہے جس میں عورت کے وجود کا بھرپور احساس نمایاں ہے۔ مغربی رجحانات اور کارل مارکس اور فرائیڈ سے متاثر ہونے کی وجہ سے انہوں نے روایتی رویوں سے کنارہ کشی اختیار کی اور ایک نئی فضا میں سانس لینے کی کوشش کی۔ فہمیدہ نے عورت کے منصب اور مسائل کو مقامی اور آفاقی حوالوں سے دیکھنے کی کوشش کی اور کائنات، فطرت اور عورت کو آپس میں مدغم کر کے اپنی شاعری کو وسعت بخشی، فہمیدہ نے عورت کو ایک ذہین اور باشعور ہستی کے طور پر بیان کیا ہے۔ ان کی نظمیں، "اقلیما" اور "مقابلہ حسن" خاص طور پر اس رویے کی طرف ایک احتجاج ہے جہاں عورت کی صرف ایک جنس سمجھا جاتا رہا ہے اور اس کے ذہن کو موضوع نہیں بنایا گیا۔ اس طرح عورت کو صرف تفریح اور تزئین و آرائش کی شے بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ فہمیدہ نے اس کے خلاف شدید رد عمل کا اظہار کیا جو ان کی نظم "اقلیما" میں ظاہر ہے۔

اقلیما

جو ہابیل اور قابیل کی ماں جائی ہے
ماں جائی
مگر مختلف

وہ اپنے بدن کی قیدی
تپتی ہوئی دھوپ میں جلتے
ٹیلے پر کھڑی ہوئی ہے
پتھر پر نقش بنی ہے
اس نقش کو غور سے دیکھو
اقلیما کا سر بھی ہے
اللہ کبھی اقلیما سے بھی کلام کرے
اور کچھ پوچھے! [۵۳]

اُردو نسائی شاعری کا ایک بہت بڑا نام پروین شاکر کا ہے۔

جن کے ہاں ایک نرم و نازک سی ایک لڑکی نظر آتی ہے جس نے اپنے وجود میں انسانی جذبوں کی تمام گہرائیوں کو جمع کر رکھا ہے۔ پروین شاکر ایک ایسی شہزادی نظر آتی ہے جس کے تمام جسم کو سوئیوں سے گوند کر طلسمی خواب کا اسیر کر دیا گیا ہو اور اسے کسی شہزادے کی آمد کا انتظار ہو جو آئے اور اس کی سوئیاں نکال دے کہ شہزادی پھر سے زندوں میں آجائے۔ پروین شاکر کے ہاں بھی ذہنی ارتقا بہت واضح دکھائی دیتا ہے وہ ایک نرم و ملائم رومانی دنیا میں بسنے والی لڑکی سے زندگی کی سفاک حقیقتوں کو سمجھتی اور ان سے الجھتی عورت میں بدلتی دکھائی دیتی ہے۔ اس نے معاشرے پر تنقید کرتے ہوئے باغبانہ لہجہ بنایا ہے۔ مگر ضبط کے دامن کو ہاتھ نہیں جانے دیا۔

اگر ایک جگہ وہ کہتی ہیں:

ممکنہ فیصلوں میں ایک ہجر کا فیصلہ بھی تھا
ہم نے تو ایک بات کی اس نے کمال کر دیا [۵۴]

تو دوسری جگہ کہہ رہی ہیں:

اس کی مٹھی میں بہت روز رہا میرا وجود

مرے ساحر سے کہو اب مجھے آزاد کرے [۵۵]

پروین شاکر کی شاعری میں عام اور نچلے طبقے کے مفلس بیمار اور استحصال زدہ لوگوں کا ذکر بھی ملتا ہے وہ ان عورتوں کی تصویر کشی بھی کرتی ہے جن کو ہمیشہ درجہ دوم کا شہری سمجھا گیا ہے۔ اور جن کو ان کا حق بھی بھیک کی طرح ملتا ہے۔

شیرے کے گھر والی

ہے رہ تیری کیا اوقات

دودھ پلانے والے جانوروں میں

اے سب سے کم اوقات

پُرش کی پسلی سے تو تیرا جنم ہوا

اور ہمیشہ پیروں میں تو پہنی گئی

جب ماں جایا پھلواری میں تتلی ہوتا

ترے پھول سے ہاتھوں میں

ترے قد سے بڑی جھاڑو ہوتی

ماں کا آنچل پکڑے پکڑے

تجھ کو کتنے کام آجاتے

اُپلے تھاپنا

لکڑی کاٹنا

گائے کی سانی بنانا

پھر بھی مکھن کی ٹکیہ

ماں نے ہمیشہ بھیا کی روٹی پر رکھی

اور نظم کے آخر میں

کن کرموں کا پھل ہے تو

تن بیچے تو کسبی ٹھہرے

من کا سودا کرے اور پتنی کہلوائے

سمے کے ہاتھوں پلا تا رہے گا

کب تک یہ اپمان

ایک نوالہ روٹی

ایک کٹورے پانی کی خاطر

دیتی رہے گی کب تک تو بلیدان! [۵۶]

زہرا نگاہ ایک ایسی شاعرہ ہیں جنہوں نے عائلی زندگی کی الجھنوں اور پریشانیوں اور خالی پن کو اپنا موضوع بنایا۔ دو رفیقوں کے درمیان جو اجنبیت کی نامعلوم دیوار کھڑی ہو جاتی ہے۔ اس کی صورتیں مختلف ہو سکتی ہیں مگر بنیادی وجہ مردانہ برتری اور فوقیت کا آسیب ہے۔ اس تصادم میں عام طور پر عورت کو ہی پسپا ہونا پڑتا ہے کیوں ایک اسیر معاشرے کا دباؤ اس کی واپسی کے تمام راستے مسدود کر چکا ہوتا ہے۔ تب ہی اسے کہنا پڑتا ہے۔

ملائم گرم سمجھوتے کی چادر

یہ چادر میں نے برسوں میں بنی ہے

کہیں بھی سچ کے گل بوٹے نہیں ہیں

کسی بھی جھوٹ کا ٹانکا نہیں ہے [۵۷]

شبنم شکیل نے کچھ ایسی نظمیں تخلیق کی ہیں جو صرف نسائی تجربے کی بنیاد پر ہی لکھی جاسکتی ہیں۔ ان کے ہاں رومان، محبت، ہجر، وصال تمام صورتیں موجود ہیں۔ "بانجھ پن کی دعا"، "ورثہ" "منکہ اصغری خانم"، ان کی نمائندہ نظمیں کہلائی جاسکتی ہیں۔ عورت کے ذاتی تشخص، اسکی انفرادیت، اظہار ذات، معاشرے میں مساوی کردار اور نسائیت کو جن جن شاعرات نے اپنا موضوع بنایا ان کی ایک طویل فہرست موجود ہے۔

چند نام یہ ہیں: فاطمہ حسن، شاہدہ حسن، نسرین انجم بھٹی، عشرت آفرین، سارا شگفتہ، عذرا عباس، تنویر انجم، عطیہ داؤد، یاسمین حمید، حمیدہ شاہین، عنبرین صلاح الدین، بشریٰ اعجاز اور بے شمار لکھنے والیاں جن کے ہاں نسائی تجربے کا اظہار بھی ہے۔ زندگی کی سچائی بھی اور ایک ایسا وژن بھی ہے جو اپنے جمالیاتی اظہار کے ساتھ انفرادیت پر دلالت کرتا ہے۔

جب ہم نسائی تصور اور عورت کے ہاں اظہار ذات کی بات کرتے ہیں تو ان خواتین کا ذکر بے جا نہ ہو گا جو نثر میں اپنے تخلیقی تجربات سے ادبی خزانے میں گراں قدر اضافے کر رہی تھیں اور آج بھی اپنے فکر و شعور کی وجہ سے الگ رجحان رکھتی ہیں۔

ترقی پسند تحریک خواتین کے لیے اور خاص طور پر افسانہ نگار اور ناول نگار خواتین کے لیے بہت سازگار ثابت ہوئی جس نے ڈاکٹر رشید جہاں، نذر سجاد حیدر، حجاب امتیاز علی، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، خدیجہ مستور، حاجرہ مسرور اور دیگر بہت سی خواتین کو ممنوعہ موضوعات پر لب کشائی کی تحریک دی۔

عصمت چغتائی کا "ٹیڑھی لکیر"، قراۃ العین حیدر کا "آگ کا دریا" خدیجہ مستور کا "آنگن" تو ایسے فن پارے ثابت ہوئے جنہوں نے قارئین اور ناقدین پر مطالعے کے نئے باب کھولے۔ بانو قدسیہ کے ناول "راجہ گدھ" میں جو فلسفہ پیش کیا گیا اس پر آج تک بحث جاری ہے۔

جمیلہ ہاشمی، ، الطاف فاطمہ، رضیہ فصیح احمد، خالدہ حسین، واجدہ تبسم، جیلانی بانو اور بعد میں آنے والوں میں فردوس حیدر، زاہدہ حنا، نیلم احمد بشیر، طاہرہ اقبال کے نام نمایاں ہیں، نسائی ادب دنیا کے کسی بھی

ادب کی طرح اُردو ادب کا قابل قدر حصہ رہا ہے۔ نسائی شعور خواتین کے مجموعی ادراک و شعور کا آئینہ دار ہے۔ نسائی اظہار کا رویہ تاریخ سے جڑا ہوا ہے یہ آدھی انسانی آبادی کے ذہنی و فکری سفر کا مطالعہ پیش کرتا ہے۔ یہ عورت کی عزت نفس پر سمجھوتا نہیں کرتا اور پدرسری سماج کے غیر انسانی رویوں، خواتین اور رواجوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتا ہے۔

۵) ایرانی فیمینزم:

شاعری زندگی کی ترجمان اور روح عصر کی آواز ہے۔ شاعر انسانی معاشرے کا ایک فرد ہے اور معاشرے کے دوسرے افراد کی طرح وہ ماحول اور گردوپیش سے اثرات قبول کرتا ہے۔ انسانی معاشرہ ایک حال میں نہیں رہتا بلکہ مستقل طور پر تغیر و تبدل سے دوچار رہتا ہے۔ معاشرے کی ترجمان ہونے کی حیثیت سے شاعری بھی اپنے دور کی ذہنی اور فکری رجحانات اور اجتماعی نظریات کی عکاسی کرتی ہے۔ شاعر حالات و واقعات کے تقاضوں سے بے خبر نہیں رہ سکتا۔ وہ بے خبر رہ کر بھی شعوری طور پر ماحول اور فضا سے اثر قبول کرتا ہے۔

فارسی شاعری کی تاریخ بہت قدیم اور اس کی روایات بہت درخشاں ہیں۔ پچھلے ایک ہزار برس میں اس کے سوتے کبھی خشک نہیں ہوئے۔ اس میں زندگی کا عمیق فلسفہ، گہرے عرفانی حقائق، بلند اخلاقی تصورات اور حسن و عشق کی گوناگوں کیفیات کا بیش بہا خزانہ موجود ہے۔ مختلف ادوار میں جدت پسند اور تازہ پرداز شاعروں نے اس تخلیقی عمل کو برقرار رکھا ہے۔ اور اس میں مختلف اسالیب اور مکاتبِ فکر کے طویل سلسلے نظر آتے ہیں۔

دنیا کے ہر ادب کی طرح فارسی ادب میں بھی نسائیت کا اظہار اب ایک حقیقت بن چکا ہے اور عورتوں کے اظہارِ رائے کے لیے یہ ادب ایک موثر ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ ایران میں ہر دور میں نسوانی تحریکیں چلتی رہی ہیں اور مغربی معاشروں کے زیرِ اثر فیمینزم یا تانیثی کی تحریک نے ایرانی عورت کو بھی اپنے مقام اور تشخص کو متعین کرنے میں مدد دی ہے۔

ایران میں فیمینزم کی ابتداء کا تذکرہ کرنے سے پہلے ہمیں ایرانی معاشرے کی حالت زار کا جائزہ لینا ہو گا۔

قدیم ایرانی معاشرے میں عورت کی کوئی حیثیت نہیں تھی اور اگر کسی درجے سے اسے اہمیت دی بھی جاتی ہے تو وہ صرف ایک غلام کی اہمیت ہوتی۔ شوہر مجاز تھا کہ اپنی بیوی یا بیویوں میں سے ایک کو کسی دوسرے شخص کو جو انقلاب روز گار سے محتاج ہو گیا ہو، اس مقصد کے لیے دے دے کہ وہ کسب معاش میں مدد دے۔ اس میں عورت کی رضامندی نہیں لی جاتی تھی۔ عورت کو شوہر کے مال و اسباب پر تصرف کا کوئی حق نہیں تھا اور اس عارضی ازدواج کے نتیجے میں جو اولاد ہوتی تھی وہ پہلے شوہر کی سمجھی جاتی تھی۔ یہ مفاہمت ایک باضابطہ قانونی اقرار نامہ کے ذریعے ہوتی تھی۔ قانون میں بیوی اور غلام کی حالت ایک دوسرے سے مشابہ تھی۔ ایران میں عرب کی طرح لڑکے کی پیدائش پر انتہائی خوشی اور جبکہ لڑکی کی پیدائش پر مایوسی کا اظہار کیا جاتا تھا۔ بیٹا پیدا ہوتا تو شکر کے اظہار کے لیے بہت سی مذہبی رسوم کی جاتی تھیں جنھیں دھوم دھام اور خوشیوں سے منایا جاتا، صدقے دیے جاتے تھے لیکن بیٹی پیدا ہونے کی صورت میں کوئی خوشی نہیں منائی جاتی تھی۔ ایرانیوں کا عقیدہ تھا کہ عورت ناپاک ہے اور اس کی نظر کا بد اثر ہوتا ہے اور خاص طور پر اگر کسی بچے پر اس کی نظر پڑ جائے تو اس بات کا خوف رہتا ہے کہ بچے پر ضرور کوئی نہ کوئی بد بختی آئے گی۔ اس لیے اس دور میں عورتوں کو بچوں کے پاس آنے نہیں دیتے تھے۔ زمانہ قدیم میں ایرانی معاشرے میں مرد سالاری تھی حتیٰ کہ لڑکیوں کے لیے شوہر کے انتخاب کا اختیار بھی والد یا گھر کے سربراہ کو حاصل تھا۔ شادی کے بعد لڑکی کا تعلق دوسرے خاندان سے ہوتا تھا۔ عورتوں کو وراثت کا حق بھی حاصل نہیں تھا۔ پورا معاشرہ مرد سالاری تھا اور صرف مردوں کو ہی ہر قسم کا اختیار حاصل تھا۔

دنیا میں فیمینزم کی تاریخ ۱۵۰ سال سے پرانی نہیں ہے لیکن ایران میں اس دور میں ایک عورت نے حکومت کی "پوران دخت" جو ساسانی دور میں بھی خاتون بادشاہ ہے، نے ایک ہزار سال پہلے اپنے نظریے کو بیان کرتے ہوئے کہا تھا کہ

بادشاہ خواہ مرد ہو یا عورت اپنی سرزمین کی حفاظت اس کی ذمہ داری ہے اور عوام کے ساتھ عدل و انصاف سے پیش آنا چاہیئے۔[۵۸]

تہران یونیورسٹی میں شعبہ آثار قدیمہ کے استاد محمد باقر وثوق نے پوران دخت کے دور کے بارے میں تفصیل سے بیان کیا ہے اور اس دور میں عورت کی اہمیت واضح کی ہے۔ ساسانی دور میں عورتوں کو حقوق حاصل نہیں تھے اور وہ مردانہ سرپرستی میں زندگی گزارتی تھیں لیکن ان شرائط کے باوجود پورانِ دخت نے تاج شاہی اپنے سر پر رکھا اور اپنی جنسیت پر توجہ دئے بغیر حکومت کی۔

قاجاری دور میں بھی عورتوں کو مردوں کے برابر مقام حاصل نہیں تھا۔ ایک تحقیق کے مطابق صرف ایک فیصد اور خواتین اپنی زمین کی مالک تھیں جبکہ اس سے بھی کم فیصد خواتین دکان داری کرتی تھیں۔ اس دور میں خواتین کے لیے حصولِ علم کے امکانات کم تھے۔ عام طور پر لوگ پڑھی لکھی خواتین کو اسلام اور معاشرے کے لیے خطرہ تصور کرتے تھے۔ اس دور میں عام تصور یہ بھی تھا کہ خواتین علم و دانش کو ذہنوں میں جگہ دینے کی صلاحیت نہیں رکھتیں۔ پڑھی لکھی خواتین کو معاشرے کے لیے کلنک سمجھا جاتا تھا۔

پڑھی لکھی خواتین اپنی تعلیم کو چھپاتی تھیں ناصر شاہ طوسی کی اپنی بعض بیویاں پڑھی لکھی تھیں مگر بادشاہ اس سے لاعلم تھے۔[۵۹]

ناصر الدین قاجار کی بیٹی نے ایرانی خواتین کے بارے میں اپنی یاداشت میں لکھا ہے کہ:

افسوس ہے کہ ایرانی خواتین انسان کی کسی بھی قسم سے الگ ہیں۔ ایرانی خواتین کی زندگی دو چیزوں سے مرکب ہے جب گھر سے باہر نکلتی ہیں تو سیاہ چادر میں اور جب مر جائیں تو سفید کفن میں لپٹی ہوئی ہوتی ہیں۔[۶۰]

انقلاب مشروطہ کے بعد رضا شاہ نے اقتدار سنبھالا تو انہوں نے اداروں کو دوبارہ منظم کیا۔ رضا شاہ اپنے آپ کو آریائی نسل سے شمار کرنے پر فخر کرتے تھے چنانچہ انہوں نے آریامہر کا لقب اختیار کیا اور اپنے آپ کو ایران کی قدیم شہنشائیت سے وابستہ کر کے ۲۵۰۰ سالہ جشن قدیم شہنشاہی منایا اور کروڑوں روپے خرچ کر کے دنیا بھر کے سربراہانِ سلطنت کو دعوت دی اور سن ہجری کو سن شہنشاہی سے تبدیل کیا۔ رضا شاہ

نے اپنی مطلق العنانیت کو دوام بخشنے کے لیے روز نامہ اخباروں پر پابندی عائد کر دی، پارلیمنٹ میں قانون ساز ی کے اختیارات کو نمائندوں سے لے لیا، پارلیمنٹ کی تبدیلی اور فرماں بردار اداروں کے ذریعے من پسند وزراء متعین کیے۔ رضا شاہ نے ایران میں بہت سارے ترقیاتی کام کروائے جن میں بنکوں کا قیام، یورپی طرز تعلیم، عورتوں کے لیے ملازمت کے مواقع، سرکاری کارخانوں کا قیام، ریلوے لائنوں سمیت دیگر اقدامات شامل ہیں۔ ان کے دور میں کئی اخباروں کے مدیروں کو سختی کا سامنا کرنا پڑا۔

> رضا شاہ نے پہلی بار ایران میں عورتوں کے لیے پردہ ختم کر دیا اگرچہ عورتوں کو مردوں کے برابر حقوق دینے کا اعلان کیا۔ شروع میں انہوں نے تعلیمی اداروں میں مخلوط تعلیمی نظام رائج کیا۔ یونیورسٹی میں طلبا و طالبات کے لیے تعلیم کے مساوی مواقع فراہم کیے۔ ایران میں پہلی مرتبہ پرائمری سطح کی تدریسی عمل کو خواتین کے حوالے کر دیا۔ لیکن انہوں نے حقیقی آزادی پر جو قدغن لگانے کی کوشش کی اس سے عوام میں ایک خوف سا پیدا ہو گیا۔ رضا شاہ کے دور میں عورتوں پر آزادی کے نام پر ظلم کیا جاتا رہا در حقیقیت آزادی کے نام پر ان سے آزادی چھینی گئی۔[۶۱]

مشروط انقلاب سے پہلے اور بعد میں عورتوں کے حقوق کے لیے کام کرنے والی نامی گرامی خواتین نے عورتوں پر ہونے والی نا انصافی اور ظلم کے خلاف توانا آواز اٹھائی۔ مشروط تحریک کے دوران اسکندری نامی خاتون نے ایک موثر اور مضبوط تنظیم کی بنیاد بھی رکھی لیکن اس کے باوجود انقلاب مشروط کی کامیابی کے بعد خواتین انقلاب کے نتیجے کی حصہ دار نہ بن سکیں اور نہ صرف حق رائے دہی سے محروم رہیں بلکہ ان کے حقوق کے بارے میں قانون سازی بھی نہ ہو سکی۔

انقلاب مشروط کے بعد کچھ خواتین کے با قاعدہ اعلانیہ طور پر تنظیموں کے قیام کا اعلان کرتے ہوئے عملی طور پر حقوق نسواں کے لیے کام شروع کیا۔ "انجمنِ حریتِ نسواں" ان اولین انجمنوں میں سے ایک ہے جو تہران کے پارکوں میں اپنا اجلاس کرواتی تھیں۔ ان کا مقصد اجلاس کے ذریعے عورتوں کے سیاسی، اجتماعی اور معاشرتی مسائل کی نشان دہی کر کے ان کے حل کے لیے کوشش کرنا تھا۔ اس دور میں لڑکیوں کا سکول جانا

معیوب سمجھا جاتا تھا۔ بعض سکولوں پر حملے کئے جاتے اور انہیں فحاشی کا اڈہ سمجھا جاتا۔ لیکن اس طرح کی تنظیموں نے لڑکیوں کی تعلیم کی راہ میں حائل رکاوٹوں کو توڑنے اور سکولوں کے قیام کی حتی الامکان کوشش کی اور خواتین کی تعلیم کے بارے میں جو منفی سوچ معاشرے میں چل رہی تھی اس کو ختم کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ بی بی استر آبادی نے دوسرا قدم اٹھاتے ہوئے خواتین کے لیے خصوصی میگزین کی اشاعت پر توجہ دی اور پہلی بار "ایرانِ نو" کے نام سے ایک روزنامہ کا اجراء کیا یہ سلسلہ چلتا رہا اور چند سال کے بعد کئی ہفت روزہ، ماہنامے اور روزنامے منظرِ عام پر آنے لگے اس طرح ہر طرف سے خواتین کے حقوق اور ان کے مسائل کے حل کے لیے آوازیں اٹھنے لگیں۔ اور بنیاد پرستی کا خاتمہ، خواتین کی معاشی آزادی حجاب پر پابندی اور ۱۵ سال سے کم عمر لڑکیوں کی شادی روکنے میں یہ خواتین بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگی۔ ان خواتین نے عورتوں کو بچے پیدا کرنے والی مشین کے تصور سے نکال کر معاشرے میں نسلِ نو کی تربیت کرنے کی ذمہ دار کے طور پر پیش کیا۔

The history of Iranian women's quest for equal rights and their collective actions for sociopolitical empowerments dates back to the formation of the modern social movements for constitutionalism and democratic nation -state building in the late **19**th and early **20**th centuries. In Iran, as in other parts of the world, the women's movement and feminist discourse are by-products of modernity and industrial capitalism. At the same time the women's movement, especially feminism, has presented a challenge to and a critique of the endrocentric and unjust experts of modernity. Moreover, since modernity in Iran and in many other middle eastern countries has been associated with Western intrusion, colonialism or emperialism, it has resulted in mixed feelings among

many women and man. That is, fascination with progressive aspects of modernity and strong desire to become modern, yet at the same time, a resentment and resistance against western domination.[۶۲]

ایرانی خواتین نے ہر میدان میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوانے کی کوشش کی۔ فہمینہ میلانی پہلی فلم ساز خاتون ہیں جنہوں نے "دوزن" کے نام سے فلم بنائی اور برلن میں منعقدہ سالانہ فلمی نمائش میں بھی حصہ لیا۔ جب خواتین اپنے حقوق کے لیے آزادانہ اٹھانے لگیں تو مردوں کو لگا کہ خواتین مردوں کے خلاف ہو گئی ہیں۔ اس طرح ان کو اندیشہ لاحق ہونے لگا کہ کہیں مردوں کے لیے مسائل نہ کھڑے ہو جائیں جس کے باعث مردوں نے خواتین کی تحریکوں اور تنظیموں کی مخالفت کی۔ حتیٰ کہ جن مردوں نے خواتین کی حمایت کی ان کو بھی مخالفت کا سامنا رہا۔ اس طرح خواتین کے حقوق کے لیے اٹھنے والی آواز کو مردوں کے خلاف جنگ کا نام دیا جانے لگا اور ایک زمانہ ایسا آیا کہ خواتین اس کو فیمینزم کا نام دینے لگیں اور دنیا کے دوسرے ممالک کی خواتین کی طرح فیمینزم کی تحریک سے اثرات قبول کرنے لگیں۔

شعر و ادب کے حوالے سے جدید خیالات کی تحریک اردو اور فارسی شاعری میں قریب قریب ایک ہی عہد میں شروع ہوئی۔ اردو میں یہ تحریک ۳۲/ ۱۹۳۱ اور فارسی میں ۱۹۳۵ کے لگ بھگ ہوئی۔ نیما یوشیج پہلا ایسا شاعر تھا جس نے جدید لہجے میں بات کی اور مدت تک فارسی کے قدامت پرست شاعروں اور نقادوں کے طعن و استہزا کا شکار رہا۔ نیما نے فارسی کو قافیے، ردیف اور مروجہ عروض کی پابندیوں سے نجات دلائی۔ احمد شاملو کی نظموں میں فکر کی بے پناہ وسعت پائی جاتی ہے۔ جدید خواتین شاعرات میں پروین اعتصامی کا نام بہت اہمیت کا حامل ہے۔ لیکن فروغ فرخ زاد پہلی خاتون ایرانی شاعرہ ہے جس نے پہلی بار نسوانی احساسات کو بروئے کار لاتے ہوئے شاعری کی ہے۔ فروغ نے جہاں خواتین کے خلاف ہونے والے مظالم کے خلاف اپنی بھرپور آواز اٹھائی وہیں صدیوں سے خاموش عورت کے نفسیاتی و ذہنی معاملات کے بارے میں چپ بھی توڑ دی۔

انور مسعود نے فروغ کے بارے میں ایران کے کچھ نقادوں کی رائے کو یوں جمع کیا ہے۔

شاعری مرد کی زبان سے اس کے راز سن سن کر تنگ آچکی تھی فروغ کی زبان سے
پہلی مرتبہ عورت ذات کے راز سُنے۔[۶۳]

فروغ تن تنہا قرنوں کی خاموش ایرانی عورت کی زبانِ گویا ہے۔[۶۴]

ایرانی عورت جو صدیوں سے شاعرانہ خلاقیت کے اعتبار سے بانجھ تھی۔ فروغ فرخ
زاد کی ذات میں حاملہ ہوئی۔[۶۵]

فروغ کی آواز ایرانی خواتین کی لمبی چُپ کا شدید عکس العمل ہے۔[۶۶]

فروغ ایک نئے عہد کی شاعرہ ہے اوراس عہد کو فروغ جیسی بہادر شاعرہ کی ضرورت ہے۔ یہ بہادری فروغ کی شاعری کا سب سے اہم لازمہ ہے۔ اس کی شاعری ایک عالمگیریت کا پتہ دیتی ہے۔ اسے جغرافیائی اور قومی حدود تک قید نہیں کیا جاسکتا۔ ن۔ م۔ راشد نے اس کی شاعری کو متین شاعری قرار دیا ہے اور خود فروغ کی اپنے بارے میں پیش گوئی ہے۔

میں اس دروازے کی طرح ہوں جسے آنے والے لمحوں کے لیے بند کر دیا جائے گا۔[۶۷]

ایران میں اظہار پر پابندیوں اور بعد ازاں اسلامی انقلاب کے باعث بہت عرصہ تک فروغ کی شاعری اور شخصیت پر بات نہیں کی گئی۔ لیکن اس بات میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ ایران میں تانیثیت کی سالار اگر کسی کو قرار دیا جاسکتا ہے تو وہ فروغ فرخ زاد ہی ہے۔

ج) فروغ فرخ زاد اور کشور ناہید کا مختصر تعارف

فروغ فرخ زاد ایک ایسی شاعرہ ہیں جنھوں نے اپنے شعری جوہر سے ایران کے ادبی منظر نامے کو خیر ہ کر دیا۔ ان کے کلام کی سحر بار نغمگی، جرات، خود اعتمادی اور بے جھجھک نسوانی اظہار نے اپنے بڑھنے والوں کو آج تک مبہوت کر رکھا ہے۔ ان کی گھریلو زندگی، پیشہ وارانہ مصروفیات اور شاعری سے ظاہر ہے کہ وہ ایک آزاد اور ثابت قدم عورت ہیں جس نے معاشرے کے طے شدہ ممنوعہ راستوں سے باہر چلنے کی بجاے ے اپنا راستہ حیرت انگیز آزادی کے ساتھ منتخب کیا۔

فروغ فرخ زاد ۱۹۳۵ میں تہران میں پیدا ہوئیں۔ ان کے والد ایک آرمی آفیسر تھے۔ انہوں نے شاعری کا آغاز بہت چھوٹی عمر میں غزل سے کیا لیکن بہت جلد اسے ترک کر دیا۔ مصوری سکول میں داخلہ لیا اور پھر سلائی بھی سیکھی۔ سولہ برس کی عمر میں خود سے پندرہ سال بڑے پرویز شاپور سے انہیں عشق ہو گیا اور جلد ہی انہوں نے شادی کر لی۔ ایک بیٹے کی ماں بنیں لیکن فروغ فرخ زاد کی ذہنی پختگی میں اضافہ کے ساتھ ہی آپ کے شوہر کے ساتھ اختلافات بڑھنے لگے اور بالآخر طلاق پر منتج ہوئے۔ طلاق کے بعد فروغ فرخ زاد کے مالی حالات نہایت دگر گوں ہو گئے۔ والد نے ناراضگی میں گھر سے نکال دیا اور فروغ فرخ زاد رسالوں میں لکھ لکھ کر غربت اور تنگ دستی میں زندگی گزارنے لگیں۔ اپنے بیٹے کی تحویل کے لیے انہوں نے طویل مقدمہ لڑا لیکن ہار گئیں۔ فروغ فرخ زاد کی پہلی کتاب کی اشاعت کے بعد ان کے حالات میں کچھ بہتری آئی تو انہوں نے بیرون ملک سفر اختیار کیے اور مختلف زبانوں میں مہارت حاصل کر لی جن میں انگریزی، فرانسیسی، جرمن اور اطالوی زبانیں شامل ہیں۔ اٹلی میں فروغ فرخ زاد نے فلم بنانے کا ایک کورس کیا اور وہیں ان کی ملاقات ابراہیم گلستان سے ہوئی جو ان کی زندگی کا اہم حصہ رہے۔ واپس ایران آ کر فروغ فرخ زاد ایران کی فلم صنعت سے وابستہ ہو گئیں۔ فروغ فرخ زاد کے دل میں اپاہج، مفلوج اور کوڑھ زدہ لوگوں کے لیے خصوصی گوشہ تھا۔ وہ باقاعدگی سے جذام خانے کے چکر لگاتی تھیں۔ ان بے چہرہ مظلوم لوگوں کے لیے انہوں نے ایک فلم بھی بنائی۔ ان کی پانچ کتابیں منظر عام پر آئیں۔ جن کے نام "اسیر، دیوار، عصیاں، تولدئ دیگر اور ایمان بیاوریم" ہیں۔ عشق و محبت، جنس، رومان، محرومی، آرزو، کرب، فرار، دیوانگی اور تجسس فروغ کے اہم موضوعات ہیں۔ انہوں نے ایک بچہ گود بھی لیا اور مختلف ملکوں کے ادبی انجمنوں میں انہوں نے شرکت بھی کی۔ وہ ایک ناول بھی لکھ رہی تھیں جو مکمل نہ ہو سکا۔ ۱۹۶۷ میں محض ۳۲ سال کی عمر میں گاڑی چلاتے ہوئے ایک بچے کو بچانے میں وہ حادثے کا شکار ہو گئیں اور بے شمار امکانات کو ادھورا چھوڑ کر اس دنیا سے چلی گئیں۔

وہ انتہائی محنتی اور کوشش و کار سے سرشار رتھیں۔ اگر وقت انہیں مہلت دیتا تو یقیناً وہ شعر و ادب کے حوالے سے مزید اضافے کرتیں۔

فروغ کی شاعری، ان کے گہرے مشاہدے، واردات قلبی کی شدت اور بے باکی اور سچائی سے عبارت ہے۔ ان کے ہاں فکر کا ارتقاء ا نتہائی نمایاں نظر آتا ہے۔ ان کی شاعری کو خود اپنی ذات کی تلاش ہے اور نسائیت سے آگے بڑھ کر انسانیت کو موضوع بناتی ہے۔ ان کے ہاں میں ایسی عورت دکھائی دیتی ہے جو معاشرے کی روایات اور قدغنوں کو توڑ کر اپنے تشخص کے لیے آگے بڑھنا چاہتی ہیں۔ ان کی شاعری صدیوں سے چپ ایرانی عورت کا شدید رد عمل ہے اور ان تمام عورتوں کی جذبات، احساسات اور نفسیات کی تصویر ہے جن کی سوچ آواز مدت تک پہرے کا شکار رہی ہے۔

کشور ناہید کا شمار ایسی دانش ور خواتین میں کیا جاتا ہے جو اپنے پیچھے آنے والوں کے لیے مشعلِ راہ کا کام دیتی ہیں۔ عورت کے حقوق کی جنگ اور شناخت کی جدوجہد میں کشور اس ملک اولین سالاروں میں شامل ہیں۔ کشور نے واضح طور پر نسائی تصور کی نشاندہی کی ہے اور اسے متعارف کروانے میں ایک موثر کردار ادا کیا ہے۔

کشور ناہید ۱۹۴۰ میں بلند شہر، اتر پردیش، ہندوستان میں پیدا ہوئیں۔ ان کا گھرانہ ایک روایتی اور قدامت پسند گھرانہ تھا۔ جہاں عورت کے لیے ایک خاموش سامع کا کردار ہی قابل قبول سمجھا جاتا تھا۔ عورت اور مرد کے لئے الگ الگ معیارات مقرر تھے۔ مرد کے لیے ہر قسم کی آزادی اور سرکشی کی اجازت تھی اور عورت کے لیے ہر چھوٹی بات پر قیامت کے ڈراوے موجود تھے۔ ایسے ماحول سے کشور نے اپنی آواز بلند کی اور معاشرے کی مروجہ روایتوں اور معیارت پر سوال اٹھائے۔

کشور ناہید سرکاری نوکریوں میں بھی رہیں اور بہت سے رسالوں کی ادارت بھی کی۔ اپنی مرضی اور خوشی سے ازدواج کا بندھن باندھا جو انہیں راس نہیں آیا اور اس رشتے میں رہتے ہوئے انہوں نے نے زندگی کا ہر کھٹا میٹھا ذائقہ چکھ لیا۔ دو بچوں کی والدہ بنیں لیکن یہ تعلقات بھی اتار چڑھاو کا شکار رہے۔ ذاتی زندگی کے مسائل کے باوجود وہ ادبی، سیاسی اور سماجی میدانوں میں تسلسل کے ساتھ سرگرم اور متحرک رہیں۔ بے شمار کتابیں لکھیں۔ جن میں لب گویا، بے نام مسافت، گلیاں، دھوپ، دراوزے، ملامتوں کے درمیان، میں پہلے جنم میں رات تھی، ۔خیالی شخص سے مقابلہ اور دشت قیس میں لیلیٰ جیسے شاعری کے مجموعے شامل

ہیں۔ انہوں نے اپنے آپ بیتی "بری عورت کی کتھا" کے نام سے تحریر کی۔ عورت کے استحصال کے حوالے سے "عورت مرد کا رشتہ" اور "عورت زبان خلق سے زبانِ حال" تک مرتب کی۔ مغرب کے ادب پاروں کا ترجمہ بھی کیا۔ "نظمیں" کے عنوان سے دیس پردیس کے شاعروں کی نظمیں کے تراجم کیے۔

شاعری اور نثر نگاری کے علاوہ کالم نگاری بھی کرتی رہیں۔ یوں تقریباً نصف صدی سے کسی نہ کسی حوالے سے وہ شعر وادب کے افق پر نمایاں رہیں۔

کشور ناہید نے براہِ راست عورت کے جذبات اور مسائل کو موضوع بنایا اور پورے شعور اور ادراک کے ساتھ ان سماجی رویوں پر احتجاج کیا جن کی شکار خواتین تھیں۔ ان کی شاعری میں تجربات بھی ہیں، مشاہدات بھی ہیں اور وسعت بھی ہے اور تنوع بھی۔ وہ بہت چھوٹے چھوٹے نقوش کو مربوط کر کے ایک واضح نقشہ مرتب کرتی ہیں۔ مغرب کے شعراء اور شاعرات کے مطالعے اور تراجم کے باعث ان کا نسائی نقطہ نظر اور بھی مضبوط اور واضح ہوا۔ وہ ایک تانیثیت پسند شاعرہ ہیں۔ تانیثی تھیوری کے تمام اسرار ورموز سے واقفیت رکھتی ہیں ان کی تانیثیت کے پیچھے ایک باقاعدہ فلسفہ موجود ہے جس میں عورت کے حقوق کا تناظر محض سماجی نہیں کائناتی بھی ہے۔ عورت سے وابستہ معاشرتی وسماجی مسائل اور اس کی ذات کی انفرادیت اور تشخص سے منسلک ذہنی وجذباتی مسائل پر ان کی گہری نظر ہے۔

شادی، زوجیت اور دیگر اس قبیل کے مسائل میں عورت کے مقام کا اظہار انہوں نے نہایت شاعرانہ ندرت کے ساتھ کیا ہے۔

ان کا یہ باغیانہ پیکر انہیں روایتی مشرقی عورت کی صف سے ممتاز کرتا ہے۔ وہ ایک ایسی عورت ہیں جو تمام مظلوم عورتوں کی جنگ لڑ رہی ہیں۔

اس تمام تناظر میں اس مقالے کے لیے فروغ فرخ زاد اور کشور ناہید کو منتخب کیا گیا ہے تاکہ دونوں شاعرات کے تانیثی شعور کی تفہیم کی جاسکے۔ اس کے لیے ان کی شاعری کے مجموعوں کو منتخب کیا گیا ہے تاکہ باریک بینی اور یکسوئی کے ساتھ ان کی شاعری میں موجود نسائی تصور اور عورت کے جذبات، احساسات اور نفسیات کے اظہار کے ارتقائی سفر کو واضح کیا جائے۔

حوالہ جات

۱۔ سوزن بیسنیٹ، ترجمہ توحید احمد، تقابلی ادب: ایک تنقیدی جائزہ، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۵ء، ص ۵

۲۔ www.merriam.webster.com/dictionary/comparitive%. 220

literature.

۳۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، قومی انگریزی لغت، الحمرا پبلشنگ، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ص ۳۳۴

۴۔ www.wikipedia.org>wiki>comp

۵۔ ابوالاعجاز حفیظ صدیقی، کشاف تنقیدی اصطلاحات، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ص ۹۶

۶۔ سوزن بیسنیٹ ، ترجمہ: توحید احمد، تقابلی ادب: ایک تنقیدی جائزہ، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۵ء، ص ۸

۷۔ ایضاً، ص ۱۱

۸۔ انیس ہارون، فیمنیزم اور پاکستانی عورت، فیمنیزم اور ہم (ادب کی گواہی)، وعدہ کتاب گھر، کراچی، ۲۰۱۳ء، ص ۱۲۔۱۱

۹۔ جولی رفکن، ترجمہ، ارجمند آرا، تانیثیت کے نقوش (ایک تعارف)، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۱۷ء، ص ۸۰

۱۰۔ انیس ہارون، فیمنیزم اور پاکستانی عورت، فیمنیزم اور ہم (ادب کی گواہی)، وعدہ کتاب گھر، کراچی، ۲۰۱۳ء، ص ۱۳

۱۱۔ ایضاً، ص ۳۱

۱۲۔ سید محمد عقیل، تانیثیت۔۔۔۔ایک تنقیدی تھیوری، آدھی عورت۔پورا ادب، فکشن ہاؤس، لاہور ۲۰۱۷ء، ص ۱۱۳

۱۳۔ ایضاً، ص ۱۱۴

۱۴۔ ابنِ حنیف، ہزاروں سال پہلے، مکتبہ کارواں، لاہور، بار اول، ۱۹۶۰ء، ص ۱۴

۱۵۔ ایضاً، ص ۲۰۔۱۹

۱۶۔ ایضاً، ص ۱۵۴

۱۷۔ ابن حنیف، بھولی بسری کہانیاں، بیکن بکس، ملتان، ۱۹۹۶ء، ص ۲۶۳۔ ۲۶۲

۱۸۔ عقیلہ جاوید، ڈاکٹر، اردو ناول میں عورت کا تصور، آدھی عورت۔ پورا ادب، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۱۷ء، ص ۲۵۷

۱۹۔ عصمت جمیل، ڈاکٹر، اردو افسانے میں عورت کا تصور، مقالہ برائے پی ایچ ڈی، شعبہ اردو، بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی، ملتان، ۱۹۹۸ء

۲۰۔ عقیلہ جاوید، ڈاکٹر، اردو ناول میں عورت کا تصور، آدھی عورت۔ پورا ادب، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۱۷ء، ص ۲۵۹

۲۱۔ اے ایل بھاشم، ہندوستانی تہذیب کی داستان، نگارشات لاہور، ۱۹۹۹ء، ص ۲۷۱

۲۲۔ مبارک علی، ڈاکٹر، تاریخ اور عورت، ص ۴۰

۲۳۔ شبلی نعمانی، الکلام: معارف اعظم گڑھ، ۱۳۵۵ھ، ص ۱۵۶

۲۴۔ شرافت حسین سید، عورت مذہب اور حکومت، نسیم بک ڈپو، لاہور، ص ۵۰

۲۵۔ سید امیر علی، روح اسلام، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، بار پنجم، ۱۹۹۰ء، ص ۳۹۶

۲۶۔ ڈاکٹر نوال سعدوی، عورت زبان خلق سے زبان حال تک، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۰ء، ص ۱۲۶

۲۷۔ تدبیر قرآن، جلد سوم، ص ۱۹۴

۲۸۔ وارث میر، پروفیسر، کیا عورت آدھی ہے، نگارشات، لاہور، ۱۹۸۹ء، ص ۹۰

۲۹۔ Afular Rehman, Role of Muslim Women in Society, Search Foundation, London, **1986**, P-**132**

۳۰۔ عبدالقیوم ندوی، اسلام اور عورت، ص۳۵

۳۱۔ افتخار شیروانی (مترجم)، عورت کی محکومیت، ص۹

۳۲۔ سید محمد عقیل، تانیثیت۔۔۔ایک تنقیدی تھیوری، آدھی عورت۔۔۔پورا ادب، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۱۷ء، ص۱۱۴

۳۳۔ Hanson, J.L, Dictionary of Economics and Commerce, **5**th Edition, R-Machonld & Evens, P-**62**

۳۴۔ محمد قطب: اسلام اور جدید ذہن کے شبہات، البدر پبلی کیشنز، لاہور، ص۱۷۳۔۱۷۲

۳۵۔ سید قطب، اسلام کا عدل، اجتماعی، ص۱۵۹

۳۶۔ امین احسن اصلاحی، پاکستانی عورت دوراہے پر، ص۱۷

۳۷۔ Jacob Young, News Week, April **16**, **1984**, New York

۳۸۔ افتخار شیروانی، مترجم، عورت کی محکومیت، ص۱۳

۳۹۔ مبارک علی، ڈاکٹر، عورت: تاریخ کیا کہتی ہے؟، آدھی عورت۔ پورا ادب، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۱۷ء، ص۲۶

۴۰۔ ایضاً، ص۲۷

۴۱۔ ایضاً، ص۲۹

۴۲۔ ایضاً، ص۳۱

۴۳۔ فہمیدہ ریاض، فیمنیزم اور ہم (ادب کی گواہی)، ادارت فاطمہ حسن، وعدہ کتاب گھر، کراچی، ۲۰۱۳ء، ص۳۴

۴۴۔ ایضاً، ص۳۶

۴۵۔ ایضاً، ص۳۸۔۳۷

۴۶۔ زاہدہ حنا، زبان کے زخم، ادارہ استحکام شرکتی ترقی، اسلام آباد، ص۴

۴۷۔ فہمیدہ ریاض، فیمنیزم اور ہم (ادب کی گواہی)، ادارت فاطمہ حسن، وعدہ کتاب گھر، کراچی، ۲۰۱۳ء، ص۳۹

۴۸۔ سلیم اختر، پاکستانی شاعرات: تخلیقی خدوخال، سنگ میل پبلشر، لاہور، ۲۰۰۸ء، ص۱۵

۴۹۔ شان الحق حقی، زاہدہ خاتون شیروانیہ، فیمنیزم اور ہم (ادب کی گواہی)، وعدہ کتاب گھر، کراچی، ۲۰۱۳ء، ص۶۳

۵۰۔ فاطمہ حسن، گزشتہ صدی سے عہد حاضر تک: اردو ادب میں نسائی شعور، فیمنیزم اور ہم، وعدہ کتاب گھر، کراچی، ۲۰۱۳ء، ص۸۶

۵۱۔ ایضاً، ص۸۷

۵۲۔ سلیم اختر، پاکستانی شاعرات: تخلیقی خدوخال، سنگ میل پبلشر، لاہور، ۲۰۰۸ء، ص۱۵۸

۵۳۔ فاطمہ حسن، گزشتہ صدی سے عہد حاضر تک: اردو ادب میں نسائی شعور، فیمنیزم اور ہم، وعدہ کتاب گھر، کراچی، ۲۰۱۳ء، ص۹۴۔۹۳

۵۴۔ شبنم شکیل، سلیم اختر، ودیگر (مرتبین)، خواتین کی شاعری میں خواتین کے مسائل کی تصویر کشی (۲۰۰۲ء۔۱۹۴۷ء)، وزارت ترقی خواتین، اسلام آباد، ۲۰۰۵ء، ص۱۲۱

۵۵۔ ایضاً، ص۱۲۲

۵۶۔ ایضاً، ص۱۲۸ تا ۱۳۰

۵۷۔ ایضاً، ص۷۲

۵۸۔ نصرت اللہ دین محمدی، بررسی انتقادی شعر امروز ایران، جلد اول، نارنج پریس، ۱۳۷۷، ص۱۰۷/۱۰۵

۵۹۔ سید ہادی، شاہکار شاعران ایران، زمان پریس، ۱۳۱۳، ص۱۰۲/۲۹۹

۶۰۔ http://tarikhirani.ir/fa(news/30bodyview/4368/ot

۶۱۔ سید ہادی، شاہکار شاعران ایران، زمان پریس، ۱۳۱۳، ص۳۰۹

۶۲۔ http://sur.conectas.org/en/womens-rights-feminist-movements-iran

۶۳۔ انور مسعود، فارسی ادب کے چند گوشے، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۲۰۰۰ء، ص۱۷

۶۴۔ ایضاً

۶۵۔ ایضاً

۶۶۔ ایضاً

۶۷۔ ایضاً، ص۴۱

باب دوم

کشور ناہید اور فروغ زاد کی شاعری کا جائزہ
(سیاسی و سماجی مسائل کے تناظر میں)

الف) کشور ناہید اور ان کی شاعری:

کشور ناہید، ایک مدبر اور منتظم خاتون جو بیک وقت شاعرہ بھی ہے اور کالم نگار بھی۔ آزادی نسواں کی علم بردار بھی ہے اور ایک گھریلو خاتون بھی۔ طویل عرصہ تک مختلف سرکاری عہدوں پر فائز رہتے ہوئے اپنی ذمہ داریاں نبھائیں اور مختلف ادبی رسائل اور مجلوں کی ادارت بھی کی۔ ان صفات سے جداگانہ ایک پر جوش میزبان اور خوش گفتار خاتون بھی مانی جاتی ہیں۔ ان کا شمار ایسی دانش ور خواتین میں کیا جاتا ہے جو اپنے پیچھے آنے والوں کے لیے مشعل راہ کا کام دیتی ہیں۔ عورت کے لیے حقوق کی جنگ اور شناخت کی جدوجہد میں کشور اس ملک کے اولین سالاروں میں شامل ہیں۔ عورت کے جذبات تجربات، مشاہدات، اس کے ان کہنے ان لکھے جذبوں کے حوالے سے کشور نے ایک ایسی فضا مرتب کی ہے جس میں زنانہ اور مردانہ ڈبے کی تخصیص ختم ہو کر رہ گئی ہے۔ آج کے جدید زمانے کی عورت کس طرح سوچتی ہے، کیا سوچتی ہے اور اس کے وجود کے کیا کیا امکانات ہو سکتے ہیں، ان سب کی تصویر ہمیں کشور کے ہاں واضح دکھائی دیتی ہے۔ کشور ناہید نے واضح طور پر نسائی شعور کی نشان دہی کی ہے۔ اور اسے متعارف کروانے میں ایک موثر کردار ادا کیا ہے۔ انہوں نے نہ صرف اس رجحان کو تخلیقی شکل دی ہے بلکہ مغرب کے نسائی ادب پاروں کا ترجمہ بھی کیا ہے۔ کشور ناہید نے براہِ راست عورت کے جذبات اور مسائل کو موضوع بنایا اور پورے شعور اور ادراک کے ساتھ ان سماجی رویوں پر احتجاج کیا جن کا شکار خواتین تھیں۔ کشور کی بیشتر شاعری نسائی شعور کی مزاحمتی شاعری ہے۔ کشور ناہید نے ۱۹۴۰ء میں بلند شہر، اُتر پردیش، ہندوستان میں جنم لیا۔ بعد ازاں ان کے خاندان نے پاکستان ہجرت

کرلی۔ ان کا خاندان ایک روایتی قدامت پسند گھرانہ تھا۔ ان کی والدہ ان کے والد کی چوتھی بیوی تھیں جو بہت چھوٹی عمر میں بیاہ کر آئیں۔ گھر میں بہت خوش حالی نہیں تھی مگر ان کی والدہ نے ان پانچ بہن بھائیوں کی تعلیم پر سمجھوتہ نہیں کیا۔ دو کی جگہ ایک روٹی کھلائی اور بڑے بہن بھائیوں کے پرانے کپڑے چھوٹوں کو پہنائے۔ گھر کے کام کرتے، کھانا بناتے، چولہے کے گرد سب بچوں کو بٹھا کر اردو حساب سکھایا، مگر کتاب سے آنکھ نہ اٹھانے کی ضد کی۔ ان کے خاندان میں پردے کا یہ عالم تھا کہ خواتین دامادوں کے سامنے بھی نہیں آتی تھیں۔ نماز روزے کی سختی سے پابندی کی جاتی تھی۔ بات بات پر قیامت کے ڈراوے دیے جاتے اور چھوٹی چھوٹی غلطیوں پر سخت پُرسش کے خوف سے دھمکایا جاتا تھا۔ کشور ایسی تمام روایتوں اور رسم ورواج کی باغی ہیں جو کسی بھی انسان کو کھل کر سانس لینے سے بھی روک دیتی ہیں۔ انہوں نے خاندانی روایات کے برعکس مردوں کے ساتھ تعلیم حاصل کی، مشاعرے بھی پڑھے۔ اپنی مرضی اور خوشی سے شادی بھی کی اور دنیا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے کا فن بھی سیکھا۔

کشور ایک زود نویس شاعرہ کا نام ہے۔ "لبِ گویا"، "بے نام مسافت"، "گلیاں، دھوپ، دروازے"، "نظمیں"، "ملامتوں کے درمیان"، "سیاہ حاشیہ میں گلابی رنگ"، "خیالی شخص سے مقابلہ"، "میں پہلے جنم میں رات تھی" اور ۱۳۱۱ صفحات پر مشتمل "دشتِ قیس میں لیلیٰ" ان کی پُرگوئی کا ثبوت ہے۔

کشور ناہید جن امور میں معاصر شاعروں اور شاعرات سے مختلف نظر آتی ہیں اس میں ان کا کثیر المطالعہ ہونا بھی شامل ہے۔ بین الاقوامی ادب بالخصوص شاعری کا مطالعہ ان کی خصوصیت ہے۔ جہاں یورپین شعراء کی نظموں کے تراجم کے ذریعے سے وہ اپنے پڑھنے والوں کو بین الاقوامی شاعری کے ذائقوں سے بھی رُوشناس کروا رہی ہیں۔ یہ تراجم اس لیے بھی اہم ہیں کہ کشور ناہید کی شاعری اور شخصیت کو سمجھنے اور ان کی سوچ اور فکر کی گہرائی تک پہنچنے کے بالواسطہ مظہر قرار پاتے ہیں۔ دیس بدیس کی نظموں کے تراجم پر مشتمل مجموعہ "نظمیں" میں انہوں نے پابلو نرودا (چلی) الیگزینڈر بلاک اور آندائی وانی سنسکی (روس)، جارج سیفیرس (یونان)، کینتھ پچن (امریکہ)، ایمل ایساک، آئیون پلاٹ، لوسیان بلاگا، الفلپیڈ، اورل رایٹو، نکولائی لیپس

(رومانیہ)، لیوڈمل سٹونیوف، الیگزینڈر گروف، ولاڈیمیر باشو، لیانا دسکالووا(بلغاریہ)، ماؤزے تنگ، لوسون، کوموجو (چین) فروغ فرخ زاد (ایران)، لیو پوند سید او سنگھیور، براگووَپوپ (سینیگال) کے علاوہ بھی دیگر مملک کے شعراء کی نظموں کے تراجم کیے۔

کشور ناہید نے نسائی ادب میں ایک انتہائی اہم نام سیمون ڈی بوار (Simone de Beauvoir) کی معرکتہ الآرا کتاب Second Sex سے ماخوذ ایک کتاب لکھی" عورت زبانِ خلق سے زبانِ حال تک" سیمون اور ژاں پال سارتر کے مکالموں اور تحریروں سے اخذ و ترجمہ شدہ کتاب "عورت اور مرد کا رشتہ "تحریر کی۔ ایک اور انقلابی قدم اپنی خود نوشت "بری عورت کی کتھا" لکھ کر اٹھایا جو انتہائی فکر انگیز تخلیق ہے اور ان تمام تر روایتی Taboos کو توڑتی اور للکارتی کھائی دیتی ہے جو ہمارے معاشرے کا حصہ بن چکے ہیں۔ انہوں نے بے شمار انعامات حاصل کیے اور انہیں ستارۂ امتیاز سے بھی نوازا گیا۔

کشور ناہید نے جس دور میں شعر و ادب کی دنیا میں قدم رکھا وہ پرانی تہذیبوں کے ٹوٹنے اور نئ تہذیبوں کے وجود میں آنے کا عہد تھا۔ وہ اس دور کے سنگم پر کھڑی نظر آتی ہیں۔ ان کی کتاب "بری عورت کی کتھا" کسی ایک شخص کی آپ بیتی نہیں ہے بلکہ پوری ایک نسل کی آپ بیتی ہے۔ وہ نسل جو قیام پاکستان سے پہلے پیدا ہوئی مگر جس نے ہوش اس نئے ملک میں آکر سنبھالا۔ یہ وہ دور تھا جب یہ ملک خود ابھی سنبھلنے کے مراحل میں تھا۔ پرانے اقدار بدل رہے تھے اور اکبر الہ آبادی کی پھبتیوں کے باوجود لڑکیاں انگریزی پڑھ رہی تھیں اور زندگی کے ہر شعبے میں مردوں کے دوش بدوش مصروفِ عمل نظر آنے لگی تھیں۔ تخلیقِ پاکستان کے فوراً بعد کے ادوار میں پاکستانی معاشرہ سماجی ترقی اور روشن خیالی کی طرف بتدریج رواں تھا۔ جہاں تک معاشرے میں عورت کی حیثیت کا تعلق ہے تو اس زمانے کے سال بہ سال اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ لڑکیاں ہر سال پہلے سے بڑھ کر اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں داخلے لے رہی تھیں اور فارغ التحصیل ہو رہی تھیں۔ اس زمانے کی شہری آبادیوں میں خواتین کا ملازمت کرنا یا برسرِ روزگار ہونا ہر گز معیوب نہ سمجھا جاتا تھا۔ گو خواتین کے لیے مناسب سمجھے جانے والے پیشوں میں اسکول، کالج میں پڑھانا یا ڈاکٹری سرِفہرست تھے

لیکن دوسرے شعبوں مثلاً انگریزی صحافت، ریڈیو یا سرکاری ملازمتوں میں خواتین آہستہ آہستہ شامل ہو رہی تھیں۔ نچلے اور متوسط طبقوں میں پاکستان کے اولین وزیرِ اعظم خان لیاقت علی خان کی بیگم رعنا لیاقت علی خان کی قائم کردہ آل پاکستان ویمنز ایسوسی ایشن (APWA) نے امید کی ایک کرن پہنچادی تھی۔ اس تنظیم کا مقصد تعلیمِ نسواں کو عام کرنا اور خواتین کو اقتصادی لحاظ سے مضبوط کرنا تھا۔

۱۹۵۸ء میں پاکستان میں پہلا مارشل لاء نافذ ہوا جس کی قیادت فیلڈ مارشل جنرل ایوب خان نے کی۔ یہ تاریخ کا عجیب واقعہ ہے کہ بعض اوقات منفی حالات کے بطن سے چند اچھے، مثبت اور امید افزا نتائج بر آمد ہو جاتے ہیں۔ کچھ ایسی ہی صورتِ حال یہاں بھی نظر آتی ہے۔ جنرل ایوب خان کے مارشل لاء نے یوں تو پاکستان میں عام شہری کی تمام آزادیاں ختم کر کے ایک گھٹن کے ماحول کو جنم دیا تھا لیکن ماضی کے یہ پاکستانی آمر خواتین کے سلسلے میں کچھ روشن خیال نکلے۔ ایک طرف تو جنرل ایوب خان کے نافذ کردہ پریس آرڈیننس اور یونیورسٹی آرر ڈیننس کو پڑھے لکھے باشعور طبقے نے ہمیشہ کالے قوانین کے نام سے یاد کیا ہے۔ لیکن ان کے دور میں آنے والے عائلی قوانین کا نہ صرف خیر مقدم کیا گیا بلکہ ان کو تحفظ دینے کی کوشش بھی کی گئی۔ اُن عائلی قوانین نے پاکستان کی پڑھی لکھی باشعور خواتین میں شعور کی ایک نئی لہر دوڑا دی۔ اس آرڈیننس کے تحت پاکستانی عورت کو کئی حقوق دیئے گئے جو کہ ماضی کے بزرگ دانش ور مولانا حالی اور علامہ راشد الخیری وغیرہ کے خواب کی تعبیر کہے جاسکتے ہیں۔ ان قوانین کے تحت زبانی طلاق کا رواج ختم کر دیا گیا تھا اور مردوں پر یہ پابندی عائد کر دی گئی تھی کہ اگر وہ دوسری شادی کرنا چاہیں تو اس کی معقول وجہ پیش کریں اور پہلی بیوی کا اجازت نامہ بھی حاصل کریں۔

ستر کا عشرہ پاکستان کے لیے کئی تبدیلیوں کا حامل تھا۔ پاکستان کا مشرقی بازو علیحدہ ہو چکا تھا۔ مگر معاشرہ اس زخم کو بھلا کر اپنی راہ پر گامزن ہو گیا تھا۔ یہ تمام دور مارشل لاء کے اختتام اور پاکستان میں منتخب جمہوری حکومت کے آغاز سے عبارت ہے۔ جنرل ایوب کی لائی ہوئی تبدیلیوں اور حل نہ کیے جانے والے قومی مسائل نے ملک بھر میں ایک بے چینی کی لہر دوڑادی تھی جو ایک سیاسی جدوجہد میں تبدیل ہوئی۔ اس کے بعد ذوالفقار

علی بھٹو اسلامی سوشلزم کا منشور لے کر عوام کے ووٹوں سے سربراہِ مملکت منتخب ہوئے۔ اس سیاسی چہل پہل کا نتیجہ طبقاتی اور سماجی شعور کی وسعت پذیری کی صورت میں نکلا اور مساوات اور غیر طبقاتی نظام کی آرزو نے دانش وروں میں جڑیں استوار کیں۔ جنرل ضیا الحق کے دور میں ۱۹۷۹ء میں نافذ ہونے والے اسلامی قوانین میں خواتین کو دوسرے درجے کا شہری بنا دیا گیا۔ قانون شہادت میں دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کے برابر قرار دے دی گئی۔ حدود آرڈیننس نافذ کیا گیا جس کے تحت خواتین کے ساتھ زیادتی کی انتہا کر دی گئی۔ ریپ اور (زنا) بالجبر (Adultery) میں کوئی فرق روا نہیں رکھا گیا۔ زیادتی کا شکار ہونے والی خاتون کو خود ہی جرم کا ثبوت پیش کرتا پڑتا ہے۔ چار مسلمان، باشرع، نیک کردار مردوں کی گواہی پیش کرنا پڑتی ہے جنھوں نے اپنی آنکھوں سے زیادتی کی تمام واردات ہوتے دیکھی ہو ورنہ زیادتی کا شکار خود ملزمہ بنا کر جیل میں پہنچائی جا سکتی ہے۔

> اندھی صفیہ بی بی نے بھی جب یہ سوال کیا 'میرے ساتھ زیادتی ہوئی، میں حاملہ ہوئی ، میں زیادتی کرنے والے کا نام نہیں جانتی' شرعی عدالت نے اسی کے منہ پر تھپڑ مارا۔ اس کے لیے بیس کوڑوں اور چودہ سال قید کی سزا تجویز ہوئی۔[1]

حد کی سزا کے لیے چار مسلمان مردوں کی گواہی لازم ہے یعنی غیر مسلم مردوں کی موجودگی میں ہو تو حد کی سزا نہیں دی جا سکے گی۔ ۱۹۷۹ء سے آج تک ہزاروں کی تعداد میں غریب و لاچار عورتیں جن میں ۱۶ سے ۲۰ سال تک کی خواتین شامل ہیں زنا آرڈیننس میں جیل جا چکی ہیں۔ شوہروں نے بیویوں کو زنا کے الزام میں جیل بھجوا دیا تا کہ وہ سکون سے دوسری شادیاں کر سکیں۔ سسرال والوں اور والدین نے مرضی سے شادی کرنے پر یا بدلا لینے کی خاطر پولیس میں زنا کا کیس داخل کر دیا۔ بھائیوں نے بہنوں پر زنا کا الزام لگا دیا تا کہ ان کا حق وراثت ہڑپ کر سکیں۔ قدیم قبائلی معاشرے کے رسم و رواج نے ایسے قوانین کو سہارا دیا جہاں پہلے ہی کاری، ونی اور سوارہ جیسی رسومات اپنی پوری شدت سے جاری تھیں۔ جہاں جائیداد بچانے کے لیے قرآن سے نکاح کر دینا یا بہنوں پر کسی جن کا قبضہ ہو جانا معمول کی بات سمجھی جاتی تھی۔ بیٹیوں کو زندہ زمین میں تو نہیں گاڑا جاتا تھا مگر جیتے جی انہیں مار ڈالا جانے لگا۔ جائیداد میں ان کا حصہ دینا ہو یا نکاح کے وقت حق مہر کا قضیہ

ہو، ہر صورت میں صرف مردوں کے مفادات کو اولیت دی جاتی۔ شادی کے نام پر جس شخص کے ساتھ باندھ دیا جائے، اس کے گھر سے صرف جنازے کی صورت میں چار کندھوں پر نکلنے کی اجازت دی جاتی۔ افسوس کی بات تو یہ ہے کہ آج بھی کم و بیش یہی صورتِ حال ہے۔

یہ وہ سماجی پس منظر تھا جس نے ۱۹۶۰ء کے عشرے سے پاکستان کے فکری و ادبی حلقوں کو لا محالہ متاثر کیا۔ ترقی پسند تحریک کے زیرِ اثر بے شمار ادیبوں، شاعروں نے عام آدمی اور اس کے مسائل کو اپنا موضوع بنایا اور دنیا بھر میں چلتی ہوئی تانیثیت کی تحریک سے متاثر ہو کر معاشرے کی عمومی طور پر پسی ہوئی، مجبور اور لاچار عورت کے مسائل کی طرف بھی توجہ دی گئی۔ برصغیر کے معاشرے نے ۱۹۴۰ء سے لے کر اب تک جس طرح اپنے آپ کو بدلا ہے اور ان تبدیلیوں نے کس طرح ہماری گلیوں، محلوں اور گھروں سے لے کر ذہنوں میں کہاں کہاں جالے بنے ہیں اور کہاں کہاں کھڑکیاں کھولی ہیں، اس کی ایک جھلک کشور ناہید یوں بیان کرتی ہیں۔

> اشک آباد میں ایک شام میں اور میرا مصری دوست باتیں کر رہے تھے اپنے اپنے صحنوں اور ملکوں میں ہونے والی تبدیلیوں کی۔ وہ ہنس کر بولا 'جو باتیں تم کر رہی ہو، میں بھی اسی طرح باتیں کرتا تھا۔ میری ماں بھی برقع اوڑھتی تھی مگر اب میری بیٹی بکنی پہنتی ہے'۔ یہ بیس برس پہلے کی بات ہے میں آج یہاں اٹلی میں بیٹی اپنی کتھا لکھ رہی ہوں۔ سپین میں میری ایک بہو شارٹس اور امریکہ میں دوسری بہو سکرٹ پہنتی ہے۔ اور میری ماں ڈولی میں سفر کرتی تھی۔[۲]

کشور ناہید کی شاعری کی پہلی کتاب جو منظرِ عام پر آئی وہ "لبِ گویا" ہے۔ کشور نے اس میں غزلیں اور دوہے شامل کیے ہیں۔ اس ابتدائی مجموعے میں مخصوص نسائی انداز میں چھوٹے چھوٹے جذبوں اور احساسات کی عمدہ تصویر کشی کی گئی ہے۔ اس شاعری میں جذبہ، عقل و فہم اور تفکر پر حاوی نظر آتا ہے۔ اس میں ایک جوانی کی ابتدائی منزلوں کو عبور کرتی ہوئی ایک عورت نظر آتی ہے جو اپنی سرکشی اور اضطراب چھپانا بھی چاہتی ہے اور بیان کیے بغیر بھی نہیں رہ سکتی۔ سید سبطِ حسن کا اس سلسلے میں کہنا ہے:۔

لب گویا میں ان ادبی سراغ رسانوں کے لئے بہت بڑا مواد موجود ہے جو تحلیلِ نفسی کے شوقین ہیں یا جو فنکار کی تخلیق سے اس کی آپ بیتی مرتب کرنے کے درپے ملتے ہیں۔ لیکن حقیقیت یہ ہے کہ لبِ گویا کسی ایک شاعر کی آپ بیتی نہیں ہے بلکہ ایک پوری نسل کی آپ بیتی ہے۔ اس نسل کی جس نے گزشتہ بیس بائیس سال میں ہوش سنبھالا ہے۔ لبِ گویا اس نسل کے حسیّ تجربوں کا ہلکا سا پرتو ہے۔[۳]

اپنی پہلی کتاب کی پوری فضا میں کشور ایک خاص نوعیت کے احساسِ تنہائی میں لپٹی ہوئی نظر آتی ہیں۔ حالانکہ بظاہر ایک دفتر میں کام کرنے والی عورت جو سارا دن لوگوں کے درمیان رہتی ہو اسے اکیلے پن یا تنہائی کا احساس نہیں ہونا چاہیے۔ لیکن اس کا کیا علاج ہے کہ اس کی روح تنہا ہے۔ کشور ناہید اس تنہائی کا اظہار خالص عورت کی زبانی کرتی ہے۔

آنکھ رکھو رتجگوں سے آشنا
گود میں خوں چاٹتی خلوت بھرو[۴]

یا

ہماری عمر کہ ہے بیل عشقِ پیچاں کی
ڈھلک پڑے گی اگر کوئی آسرا نہ ملا[۵]

اور

ہے سرِ شام ماہتاب اداس
کوئی لڑکی کہیں اکیلی ہے[۶]

کبھی رات کے منظر کو تنہائی کی علامت بنا کر کہتی ہیں:

تمام رات منڈیروں پر چاندنی چمکی
تمام رات کسی گھر میں رت جگا نہ ملا

تمام رات رہا آندھیوں کا شور مگر
کسی مکان کی کھڑکی کا در کھلا نہ ملا[۷]

اس تنہائی کو بڑھانے کیسی سوچ اور خیالات آتے ہیں:

عجیب بات گریباں پہ ہاتھ ان کا ہے
جو توشہ گیر تمنا تھے حرفِ غیرت کے
دعا سے تزکیہ نفس تک سفر ہے بہت
لباس کتنے بھی بدلو گے اب ضرورت کے
زمانہ در پئے آزار ہے تو کیا ناہید
بکھرتے آئے ہیں موتی سدا مشقت کے[۸]

کشور ناہید ایک مضبوط ارادہ اور حالات کے سامنے ڈٹ جانے والی خاتون ہیں مگر ایسی عورت بھی زندگی کے سفر میں رائیگانی کا نوحہ پڑھ رہی ہے:

ٹھہرے تو ہر سفر ، سفر رائیگاں لگا
ہر اختیار، حاصلِ وہم و گماں لگا
رنجِ طلب کی کوئی نشانی نہ بن سکی
ہر رشتۂ امید بھی آشوبِ جان لگا
وہ شخص جس کی آنکھ ہے بے رنگ بے طلب
پہلے پہل ملا تو بہت مہرباں لگا
اونچی چھتوں کے شوق نے توڑا فسونِ شوق
خاکستری ز میں کی طرح آسماں لگا[۹]

لبِ گویا کی اشاعت کے وقت کشور ناہید محض ۲۹ برس کی تھیں مگر اس ابتدائی کتاب کی غزلوں میں بھی ٹین ایجرز کی جذباتی نوعیت کی شاعری دکھائی نہیں دیتی بلکہ آنے والے امکانات کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر سلیم اختر کہتے ہیں:

> لب گویا کی غزلوں میں وہ عورت نظر نہیں آتی ہے جو انٹلکچوئل یا activist ہے مگر عورت پن کے اظہار میں بھی ندرت اور اُپج ملتی ہے؛ بے نام مسافت اور ملامتوں کے درمیاں، کی نظموں میں جیسی فرسٹریشن اور اس کی پیدا کردہ تلخی کا واشگاف اظہار ملتا ہے ابھی اس نے شعری مزاج میں رنگ آمیزی نہیں کی ہے۔ لیکن نہ ہونے کا احساس اور 'کچھ اور چاہئے وسعت میرے بیان کے لیے' کا احساس بھی ہوتا ہے۔[۱۰]

کشور نے اپنی شاعری میں اپنے عہد کے حالات، جبر اور پابندیوں کا جابجا اظہار کیا ہے۔ کہیں تو یہ ڈھکے چھپے الفاظ میں کیا گیا ہے اور کہیں واشگاف طور پر اس کا اظہار نظر آتا ہے۔

دل بجھ گیا ہے، زشت کو مختار دیکھ کر
لب سل گئے ، سلاسل اظہار دیکھ کر
رکتی ہے سانس، قد غنِ اظہار کے سبب
بڑھتے ہیں دام، شوقِ خریدار دیکھ کر
اندیشہ ہائے گفتنی، نا گفتنی کے بیچ
ہنستے ہیں جام ، قحطِ قدح خوار دیکھ کر[۱۱]

ورجینیا وولف نے لکھا تھا "کون اس شاعرانہ دل کی تپش اور تشدد کی پیمائش کر سکتا ہے جو ایک نسوانی جسم میں مقید اور محصور ہے۔" واقعی ایسے شاعرانہ قلب کی گہرائیوں اور سطحوں کو سمجھنا ایک مرد کے لیے بے حد دشوار ہے۔ اس لیے کہ خواہ مرد کتنا ہی عورت سے ہمدردی اور محبت کا اظہار کرے لیکن عورت کی جسمانی، جذباتی، ذہنی پیچیدگیوں کو الجھنوں اور باریکیوں کو ورق ورق سمجھنا، پڑھنا تقریباً ناممکن ہے:

حسرتیں جاگ اٹھیں، یاس نے پہلو بدلا
اس طرح ہاتھ تری یاد نے آکر رکھا
آنکھ ہر روٹھے ہوئے شخص کی جانب اٹھی
دل ہر اک جیتے ہوئے شخص کے پیچھے بھاگا [۱۲]

شہرت بخاری اپنی رائے دیتے ہوئے کہتے ہیں:

لب گویا کی غزلوں سے عورت جھانکتی ہے جو کہ کم کم شاعرات کی تخلیقات میں جھانکتی ہے۔ ہمارے عہد کی شاعرات یا تو مرادنہ سی غزلیں کہتی ہیں جو ظاہر ہے ان کے تجربے سے قطع نظر ہوتی ہیں یا پھر سپاٹ ہو جاتی ہیں۔ یہی صورت حال نظموں کی ہے۔ ہماری نظم نگار شاعرات عموماً جنسی مسائل اور لذتیت میں اتنی ڈوب جاتی ہیں کہ ان کے ابھرنے کا انتظار کر کر کے آدمی تھک جاتا ہے اور جب وہ سر نکالتی ہیں تو اچانک انقلابی ہو جاتی ہیں، مگر کشور ناہید ان عورتوں کی زبان ہے جو ہماری عورتیں ہیں۔ جن کے شام و سحر چولہے کے پاس کٹتے ہیں۔ [۱۳]

غزلوں کے شعر تو دعوے کی دلیل کے طور پر پیش کرنا آسان ہوتے ہیں، مگر نظم کا معاملہ دوسرا ہوتا ہے۔ کشور کے ہاں ایسی نظمیں پائی جاتی ہیں جو اپنے اختصار اور بھرپور معنویت سے تیر کی طرح دل میں اتر جاتی ہیں:

میں نے اپنی ماں سے کہا تھا
میں تم سے نفرت کرتی ہوں
میں اس جرات اظہار پر
آج تک نازاں تھی
آج میرے بیٹے نے مجھ سے کہا ہے

"میں تم سے نفرت کرتا ہوں"

میرا بچپن پارہ بن کر

میرے خون میں تیر رہا ہے[۱۴]

گوپی چند نارنگ کشور ناہید کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار یوں کرتے ہیں:

> کشور ناہید ہمارے عہد کی ان خواتین شعراء میں ہیں جو اپنی ذات، ذہن، زبان اور قلم سے صحیح کام لینے میں اپنا جواب نہیں نہیں رکھتیں۔ شعر کہنا یا نثر لکھنا ایک بات ہے لیکن وجود کی پوری آگہی سے قلم اٹھانا کبھی کبھی جان جوکھوں کا کام ہو جاتا ہے۔ عالمی ادبیات میں اس وقت تحریکِ نسواں یا جنبشِ زباں کے کئی روپ ہیں اسی لیے کہ عورت کے سماجی مقام اور مرتبے کا تعلق ثقافت سے ہے۔۔۔۔۔ اردو میں اس طرف توجہ ہوئی ہے اور کچھ لوگوں نے قلم اٹھایا تو ہے لیکن اس موضوع پر بھرپور لکھنے کا شرف کشور ناہید کو ہی حاصل ہے۔[۱۵]

کشور ناہید نے اپنی زندگی اور زمانے سے گزرتے ہوئے ایسے موضوعات کا انتخاب کیا ہے جو ان کی افتادِ طبع کے عین مطابق تھے۔ ان موضوعات کے کامیاب اظہار کے لیے ہئیت میں تنوع اور اسالیب میں تجربات بھی کرتی رہی ہیں۔ ان کی شخصیت کی طرح ان کی شاعری کا بنیادی نکتہ بھی عورت کی ذات اور نفسیات ہے۔ "آگہی" ان کی ایک نظم ہے جس میں وہ عورت کی ذات پر ڈھائے گئے مظالم اور تمام عمر مشقت کی چکی میں پسنے کے باوجود کسی نوعیت کے احترام کا حق دار نہ ہونے کے غم کو یوں نمایاں کرتی ہیں:

پلے تھے ہم کوٹھری کے اندر

کہ جن کی دیوار ٹیڑھی ہو کے

ہزار کونوں میں بٹ چکی تھی

کہ جس کی کڑیاں ہماری ماں کی کمر کی صورت جھکی ہوئی تھیں

کہ جس کا دروازہ، تیل سرسوں کا پی کے کھلتا تھا، بند ہوتا تھا

اور کواڑ جس کے، ہزار چھیدوں کا آئینہ تھے

مگر وہی کوٹھڑی

جہاں پہ ہوا گزرنے کا راستہ بھی کوئی نہیں تھا

ہماری بالیدگی کا منبع بنی

ہماری ماں نے ہمیشہ روٹی پکائی ایسے

کہ ایک تھاپیٹ میں تو اک

گود میں ہمکتا

مگر نہ حرفِ گراں کبھی اس کے لب پہ آیا

میں آپ ماں ہوں

مگر مرے لختِ جان کو

آیا کی گود کی گرمیوں نے پالا

مجھے تو آرام ہے، کہ ہر روز منہ اندھیرے

وہ سامنے والی بیکری سے

منگالوں میں ناشتہ جو چاہوں

پلک جھپکنے میں، جا کے بازار سے خریدوں

جو چیز چاہوں

مجھے خبر ہے

اگر یونہی، میری ماں کی صورت

میری کمر بھی جھکی تو کوئی ساتھ نہ دے گا

نہ مامتا کے مزار پر فاتحہ پڑھے گا

غرض کے بندھن ہیں سارے رشتے

نہ مامتا نہ دلار کچھ ہے

نہ تیرا میرا ہی پیار کچھ ہے[۱۶]

کشور کی نظموں میں بے شمار عورتیں اذیت سے رینگتی دکھائی دیتی ہیں، جن کا نہ تو کوئی مونس ہے اور نہ کوئی غم خوار جو زندگی کی چوکھٹ پر پڑی سسکتی رہتی ہیں۔ نظم "کڑے کوس" میں کہتی ہیں:

حرف،

گویائی کی زنجیر میں جب قید ہوا

اسم بنا

عہد بنا

نظم بنا

قصہ کام و دہن کا غمِ مطلوب بنا

خوب و ناخوب بنا

حرف ناگفتہ

مگر ذہن کا آزار بنا

دل کی دیوار بنا

راہِ دشوار بنا

قصہ شوق کی وارفتہ کہانی نہ بنا

حیلۂ وصل کی غم دیدہ نشانی نہ بنا

دار ہے منزلِ گویائی سبھی جانتے ہیں

حرفِ ناگفتہ کے یہ زخم مگر میرے ہیں

جن کو تنہائی مری مجھ سے سواء جانتی ہے[۱۷]

اس اعتبار سے کشور ناہید کی شاعری محض ایک متعین چہرے کی تصویر نہیں بلکہ ایک ذہنی، جذباتی اور معاشرتی واردات بھی ہے۔ اس کا چہرہ سوالوں کے جس سلسلے کا قیدی ہے۔ اس کے رابطے ہمارے ساتھ کئی سطحوں پر قائم ہوتے ہیں۔ چنانچہ کشور ناہید کے ساتھ ہم کلامی کا تجربہ ایک مکمل تجربہ بنتا ہے۔

اس تجربے کے بارے میں شمیم حنفی کی رائے ہے:

> یہ تجربہ تخلیقی، جمالیاتی، لسانی، ذہنی، تہذیبی اور تاریخی تناظر کی حد بندیوں سے یکسر آزاد اور بیک وقت ان سب کا احاطہ کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ خیال کی تجسیم یا کسی جیتے جاگتے متحرک اور فعال پیکر کی تجرید کے مسائل یہاں بے معنی ہو جاتے ہیں۔ اس تجربے کی کلیت ہمیں اپنی بصیرت کے ادھورے پن کا شکار نہیں رہنے دیتی اور ہم سے ایک نئی بوطیقا کی طلب گار ہوتی ہے۔ کبھی ایک چیلنج کی صورت، کبھی ایک ناگزیر فکری ضرورت کے طور پر۔[۱۸]

سچی شاعری داخلی اور خارجی زندگی کی اثر انگیز ترجمانی کرتی ہے۔ کشور ناہید کی شاعری، زندگی، ماحول اور سماج کی عکاس اور ترجمان ہے۔ اس کی شاعری ذات سے شروع ہر کر متعلقاتِ ذات اور پھر بیرونِ ذات سفر کرتی ہے۔ اس سفر کی موضوعاتی تقسیم اس طرح ہو سکتی ہے:

۱۔ تغزل کی شاعری

۲۔ گھر اور سماج میں عورت پر ظلم اور بے انصافی کے خلاف تلخ تاثرات

۳۔ طنز اور احتجاج

۴۔ سماج، سیاست اور معاشرے کی عکاسی

اسی لیے کشور کے ہاں یہ صرف ایک عورت کا المیہ نہیں رہتی بلکہ ہر مظلوم عورت کی اجتماعی داستان بن جاتی ہے۔ کبھی کشور نے سوچا تھا کہ یہ آگہی اسے کم از کم گھاس تو بنا دے گی۔ سو وہ گھاس بن چکی ہے اور یہ گھاس آج کی باغی اور مظلوم عورت کی نشانی ہے۔ تب ہی وہ اپنی نظم "گھاس تو مجھ جیسی ہے" میں کہہ رہی ہیں:

گھاس بھی مجھ جیسی ہے
پاؤں تلے بچھ کر ہی، زندگی کی مراد پاتی ہے
مگر یہ بھیگ کر کس بات کی گواہی بنتی ہے
شرم ساری آنچ کی
کہ جذبے کی حدت کی
گھاس بھی مجھ جیسی ہے
ذرا اسر اٹھانے کے قابل ہو
تو کاٹنے والی مشین
اسے مخمل بنانے کا سودا لیے
ہموار کرتی رہتی ہے
عورت کو بھی ہموار کرنے کے لئے
تم کیسے کیسے جتن کرتے ہو
نہ زمیں کی نمو کی خواہش مرتی ہے
نہ عورت کی
میری مانو، تو وہی پگڈنڈی بنانے کا خیال درست تھا

جو حوصلوں کی شکستوں کی آنچ نہ سہہ سکیں

وہ پیوندِ زمیں ہو کر

یونہی زور آوروں کے لیے راستہ بنا دیتے ہیں

مگر وہ پرِ کاہ ہیں

گھاس نہیں

گھاس تو مجھ جیسی ہے![19]

یہ ایک سچی حقیقیت ہے کہ ایک ملازم پیشہ عورت کی زندگی دہری مشکل کا شکار ہوتی ہے۔ اسے گھر سے دن میں غیر حاضری کی سزارات کو بھگتنی پڑتی ہے۔ شام کو اس کے لیے دگنا کام تیار ہوتا ہے۔ شام کا بھی اور آنے والی صبح کا بھی۔ اسے معاشی ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ گھریلوں ذمہ داریاں بھی ادا کرنی ہوتی ہیں۔ کسی ایک وجہ سے بھی اگر کارکردگی میں کوئی کمی رہ جائے تو اسے طنز و تشنیع کا نشانہ بنایا جاتا ہے اور اس کے لیے زندگی مزید مشکل کر دی جاتی ہے۔ جب کہ ایک مرد کام کے بعد شام کو گھر آکر آرام یا تفریح کرتا ہے۔

گھر کے دھندے کہ نمٹتے ہی نہیں ہیں ناہید

میں نکلنا بھی اگر شام کو گھر سے چاہوں[20]

کشور ناہید نے عورت کی حیثیت سے دکھ سہے ہیں۔ عورت کے دکھوں کی جو تصویر انہوں نے اپنی شاعری میں کھینچی ہے وہ بہت درد انگیز ہے۔ اگر وہ بغاوت کرتی ہے تو سماج اس سے انتقام لیتا ہے۔ نہ گھر والے قبول کرتے ہیں نہ ہی معاشرہ گھر میں اس پر طمانچے پڑتے ہیں، گلا دبا دیا جاتا ہے اور گھر سے باہر لوگ اسے بدنام کرتے ہیں۔ منہ پر بھی اور پیٹھ پیچھے بھی سب اسے برا بھلا کہتے ہیں۔ اگر بغاوت نہیں کرتی تو ظلم کی چکی میں پستے رہنا اس کا مقدر ہوتا ہے۔ اپنی ایک نظم "بازگشت" میں کشور اس کا اظہار اس طرح کرتی ہیں:

تم نئی عورت ہو

فتح تمہارا مقدر نہیں

اور شکست کو تم تسلیم نہیں کرتی ہو

فیشن ایبل صابن کے ریپر کی طرح

شبِ عروسی تمہارا چمکدار لبادہ اترتا ہے

اور پھر گھلتے رہنے کی زندگی کا دور شروع ہوتا ہے

جس طرح پیاز چھیلتے ہوئے

آنکھوں سے پانی بہتا ہے

اسی طرح مرد کی شخصیت کے پرت اتارتے ہوئے

تم آنکھیں پونچھتے پونچھتے

شکستہ جہاز کی طرح خود کو لنگر انداز کرنے کی کوشش میں

بے حال ہو جاتی ہو

تم کیسی نئی عورت ہو

نہ بھولتی ہو نہ معاف کرتی ہو

دن گزرنے سے پہلے اس کا اختتامی نوحہ اچھا نہیں ہوتا ہے[۲۱]

کشور ناہید نے سینے میں گھٹی ہوئی چیخوں، برسوں سے دبی ہوئی آہوں، آنکھوں میں مرتے ہوئے خوابوں کو باہر نکلنے کا راستہ دکھایا ہے۔ دیواروں میں قید مہر بہ لب ہونٹوں کو آواز دی ہے۔

محمد حمید شاہد کا کہنا ہے:

یہ شاعری نہیں ہے، کہ ہمارے ہاں تو شاعری کی دیوی شاعر کی جلتی ہوئی پیشانی پر ہاتھ رکھتی ہے تو ایک لطیف سی نرگسیت روح میں اترنے لگتی ہے اور اس مقام کو وہ کب کا الاہنگ پھلانگ کر پیچھے چھوڑ آئی ہیں۔ اور ہاں، اگر یہ شاعری ہے تو عجیب

شاعری ہے کہ ایک کہر، خوف، ایک شدید نفرت، ایک کوندے کی طرح لپکتی
سراسیمگی بدن کے اندر اترتی ہے اور روح پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے، یا پھر پڑھنے
والے کی احتجاجی مٹھیاں بھینچ جاتی ہیں اور حلقوم کو چیرتی ہوئی چیخ نکل جاتی ہے۔[۲۲]

مرد عام طور پر جب خواتین قلم کاروں کا ذکر کرتے ہیں تو ان کے ساتھ باورچی خانہ کو نہ جانے کیوں لازم وملزوم بنا لیتے ہیں۔ حالانکہ وہ خواتین تو باورچی خانہ کی گھٹن سے نکل کر تازہ ہوا میں سانس لینے کی خواہش میں قلم اٹھاتی ہیں۔ اگر باورچی خانہ کو پسِ منظر سے ہٹاتے ہیں تو پھر نسائیت کی دکان سجا کر اس کے پس منظر میں دیکھنے لگتے ہیں۔ جب کہ خواتین جب قلم ہاتھ میں لیتی ہیں تو باورچی خانہ کیا اپنے آپ کو بھی بالکل بھول جاتی ہیں۔ اس خود فراموشی کی کیفیت میں بھی ایک آواز ہوتی ہے جس کو غالب نے صریر خامہ سے تعبیر کیا ہے۔

کشور نے بھی ہر طرف سے پتھر کھانے کے بعد لہولہان ہونے پر بھی ہمت نہیں ہاری بلکہ اپنے قلم کو تلوار بنالیا ہے جس میں حق وصداقت کی کاٹ ہے اور احساس وجذبہ کی چمک ہے۔

یہ سب رشتے
کچے رنگوں کے کچے دھاگے ہیں
ان کے اوپر چلو تو بھی لہولہان
ان کو سہو تو بھی لہولہان[۲۳]

کشور ناہید کی شاعری میں فکری دائرہ حقوقِ نسواں کی جنگ سے بڑھ کر مظلومیت کی اجتماعی داستان تک آ پہنچا ہے۔ ان کی شاعری ایک عورت کی انفرادی سرکشی کی کہانی نہیں رہتی بلکہ ایک زیریں لہر اور سیاسی شعور کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر عورت کی یہ بغاوت اپنے سماجی ڈھانچے کو بدلنے کی اجتماعی جدوجہد میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اپنی ایک نظم "نیلام گھر" میں وہ مرد کے عمومی رویے کو اس طرح بیان کرتی ہے۔

موت کا ذائقہ
لفظوں کے پیکر میں

اس کے ہونٹوں سے ٹپکتا ہے

وہ نفرتوں کو بوسوں کا رنگ دے کر

میرے منہ پر نیلے نیلے داغ ڈال کر

یہ جتانا چاہتا ہے کہ اسے میرے جسم کو ہر طرح سے استعمال کرنے کا حق ہے

یہ حق بھی کیا عجیب ہوتا ہے

حق جتانے کی خواہش

محکومیت کی ڈھال پہ اپنا چھتر بناتی ہے

حق جتانے کی خواہش

ہر کذب اور ریاکاری کو صدقے ہوتی

محبتوں کا نقاب اُڑھاتی ہے

مگر نقاب کے نیچے چہرہ

اب تو اور بھی صاف اور بھی واضح نظر آتا ہے

ترغیب اور تذلیل یکجان ہو کر

زوج بنتے ہیں

تپے ہوئے تنور سے جس طرح پھولی ہوئی روٹیاں باہر نکلتی ہیں

میرے منہ پر طمانچہ مار کر

تمہارے ہاتھوں کی انگلیوں کے نشان

پھولی ہوئی روٹی کی طرح

میرے منہ پر صد رنگ غبارے چھوڑ جاتے ہیں

تم حق والے لوگ ہو

تم نے مہر کے عوض حق کی بولی جیتی ہے [۲۴]

کشور ناہید کا یہ باغیانہ پیکر اسے مشرقی عورت کی روایتی صف سے الگ اور ممتاز کر دیتا ہے۔ وہ عورت جو کبھی اپنی زباں نہ کھولتی تھی، جسے ہمیشہ چپ رہنے، گھٹ گھٹ کر جینے اور اپنا غم کسی کے آگے بیان نہ کرنے کی تعلیم دی گئی تھی۔ لیکن اتنی قربانیوں اور غم سہنے کے باوجود اس کی قدر و منزلت میں کوئی اضافہ نہ ہو رہا تھا۔

زبیر رضوی، کشور ناہید کے بارے میں لکھتے ہیں:

> وہ جاں بازوں کی طرح سینہ سپر رہنے اور زندگی کو مجاہدانہ بسر کرنے کی خو گر ہے۔ لاہور کے ادبی اور تہذیبی زندگی کی بے شمار رونقیں کشور کے دم سے آباد ہیں۔ وہ تگ و تاز، جہد اور عمل کا ایک ایسا پیکر ہے کہ پہاڑوں کی صلابت بھی اس سے ہار مانتی ہے۔ وہ صرف مسکراتی نہیں ہے بلکہ بے ساختہ قہقہہ لگاتی ہے اور برابر بیٹھی عورت یا مرد کے ہاتھ یارانوں پر اپنی بے تکلفی کا گہرا نقش چھوڑ جاتی ہے۔ وہ بے حد گرم جوشی سے ملے گی اور مصافحے کی خوشبوئیں ہتھیلیوں میں چھوڑ جائے گی۔ وہ دریا دل ہے۔ مہمان نوازی اور دلداری اور دل جوئی اس کی فطرت اور مزاج ہے۔ اس کے دفتر میں نئے اور پرانے ادیبوں کی دن بھر چہل پہل رہتی ہے۔ لاہور کی روشن خیال بیبیاں اس پر جان چھڑکتی ہیں۔ وہ بے حد بے تکلف لب و لہجہ میں بات کرتی ہے، کبھی پنجابی بولتی ہے اور کبھی انگریزی مگر وہ زیادہ بات یو۔پی والوں کے لہجے میں کرتی ہے۔ [۲۵]

کشور ناہید ایک ایسی عورت کی عکاسی کرتی ہیں جس کی آواز دیواروں میں چُن کر بھی نہیں دبائی جا سکی۔ وہ رسم و رواج کے گھور اندھیروں سے بھی نہیں ڈری اور کچا گھڑا لے کر خوشی خوشی دریا میں اتر گئی۔ یہ وہ عورت ہے جس نے "قطرہ قطرہ زندہ رہ کر موت کو بھی مار دیا ہے"

کشور ناہید کی ابتداء میں بغاوت اپنے عورت پن سے تھی۔ کیوں کہ عورت ہونا بجائے خود اس کے لیے ایک واردات ہے۔ اس کا اظہار اس نے کہیں غصے سے اور کہیں نفرت سے کیا لیکن بعد میں اس کی جنگ ذات سے باہر نکل گئی اور پورے نظام کے خلاف ایک بڑی لڑائی میں تبدیل ہو گئی۔ کشور ایک باشعور شاعرہ ہے۔ اس نے چار دیواری سے نکل کر زندگی سے آنکھیں چار کی ہیں۔ اس نے زندگی سے جنگ لڑی ہے۔ اس کی شاعری ذہنی خط آفرینی کے بجائے اپنے عہد کے ساتھ ایک نہ ختم ہونے والے فکری اور نظریاتی مکالمے کی صورت سامنے آتی ہے۔

اپنی نظم "مکافات" میں اس بات کا اظہار یوں کیا ہے:

میں شاعری کرتی ہوں
کیوں کہ میں نے خودکشی نہیں کی
میں زندگی کرتی ہوں
کیوں کہ میں نے دلبری نہیں کی
میں نوکری کرتی ہوں
کیونکہ میں نے سروری نہیں کی

میں آگے ہی آگے چلتے رہنا چاہتی ہوں
کیونکہ مُڑ کر ویرانی نقشِ پا دیکھنے کی ہمت نہیں ہے
میں ہنستے ہی ہنستے مر جانا چاہتی ہوں
کیوں کہ چہرے کے زخم آلود گڑھوں کو مجسم کرنے کی ہمت نہیں ہے۔
ہوا کا ڈھول گلے میں ڈالو
اور دستکوں سے پوچھو

تم پلٹ کر تو نہیں آؤ گی!

میں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

میں ناگفتنی کرتی ہوں

کیونکہ میں نے گفتنی نہیں کی[۲۶]

کشور نے معاشرے کی ہر عورت کا دکھ درد محسوس کیا ہے۔ بس کے انتظار میں کالج کی لڑکیوں کا جو رُوپ ایک عورت دیکھ سکتی ہے وہ ایک مرد نہیں دیکھ سکتا۔ وہ صرف حسن کو خراج تحسین پیش کر کے، آنکھیں سینک کر گزر جائے گا کشور سوچتی ہے کہ ان لڑکیوں کی زندگی ایک طویل انتظار ہے۔ نظم "دھواں چھوڑتی بسیں" میں کہتی ہیں۔

ہماری عمریں تو بس سٹاپ پر

کالج کی بس کے انتظار میں گزر جاتی ہیں

تمہارے منہ پر بھی اُلٹا کے مارے ہوئے

سالن کا ماسک سجے

تو میں بھی پوچھوں

کہو، آنکھوں میں شبنم کو تیر تا دیکھ رہی ہو!

تمہیں بھی رات گئے، لوٹنے والے

پُرخور مسافروں کے پیر دبانے پڑیں

تو پوچھوں

ہاتھوں پر بہار کیسے کھل اُٹھتی ہے!

ہمارے پیروں میں پپوٹے اُگ آتے ہیں

اور آنکھیں سلیٹ کی طرح صاف ہو جاتی ہیں

پھر بھی کماؤ پُوت کے لئے

کنیزوں کی طویل قطار سجتی ہے

جسے چاہو اپنی سزا کے لیے منتخب کر لو

اور ہوں باقی عمر

اے کالج کے لیے جس کا انتظار کرنے والی لڑکیو

دھواں چھوڑتی بسوں کی طرح، دھکے کھا کھا کے گزار دو![۲۷]

کشور ناہید کے سماجی شعور کے ساتھ ساتھ ان کے ہاں سیاسی شعور کی بھی کمی نہیں۔ اپنے عہد کی الم ناک صورتِ حال کا عکس ان کی نظموں میں جھلکتا ہے۔ جہاں بات کہنے اور سننے کی آزادی چھین لی گئی۔ جہاں لوگ آنکھیں رکھتے ہوئے بھی اندھے، اور زبان رکھتے ہوئے بھی گونگے بنے رہنے پر مجبور کر دیئے گئے۔ دیکھیئے نظم "دفعہ ۱۴۴" کا یہ حصہ "

ہم اندھے پن کے متلاشی ہیں

جہاں تمیز کی حدیں غائب ہو جاتی ہیں

ہم بہرے پن کے متلاشی ہیں

کہ جہاں لفظ و معنی، صرف ہلتے لبوں کی جنبش میں قید ہوتے ہیں

کٹھ پتلیوں کے تار ذرا بھی غلط ہِل جائیں

تو سارا کھیل چوپٹ ہو جاتا ہے

ہم گونگے پن کے متلاشی ہیں

کہ تالی بجانے والے آواز استعمال نہیں کرتے ہیں

آواز، آزاد ہو تو نعرۂ منصور

اور گھٹ جائے تو حسن ناصر بن جاتی ہے

مگر گونگے چیخ تو سکتے ہیں

یہ کیوں ہے۔ یہ کیوں ممکن ہے!![۲۸]

"تقریر نمبر ۲۷" استحصالی نظام کے لیڈروں پر ایک بھرپور طنز ہے۔ اسے اس سماج میں پنپتی ہوئی تباہی نظر آ رہی ہے اور جب کوئی نظام بوسیدہ ہو کر تباہ ہونے ولا ہوتا ہے تو وہ اپنی تباہی کو ملک یا مذہب سے وابستہ کر کے اپنے ساتھ لازم و ملزوم بنالیتا ہے۔ اس طرح وہ نظام بچنے کے لیے آخری جتن کرتا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام کے پاس ذرائع نشر و اشاعت پر خرچ کرنے کو پیسہ بھی زیادہ ہوتا ہے اس لیے یہ نظام جب اپنی تباہی اور موت کا واویلا شروع کرتا ہے تو اسے ملک اور مذہب کی تباہی کہہ کر باور کرواتا ہے۔'

میری آواز، میرے شہر کی آواز ہے

میری آواز، میری نسل کی آواز ہے

میری آواز کی بازگشت نسل در نسل چلے گی

میں پیمبر نہیں ہوں

میں تو بس آج کو آنکھیں کھول کر دیکھ رہی ہوں

تمہیں تقریروں کے نمبر اب ازبر ہو گئے ہیں

تقریر نمبر ۱۰، غریبوں کو جگانے کی آواز ہے

تقریر نمبر ۱۵ عورتوں میں شعور بیدار کرنے کی آواز ہے

تقریر نمبر ۱۲ ادیبوں، دانشوروں کو مشورے دینے کی آواز ہے

آواز، آواز، آواز

غُل کسے کہتے ہیں

موسم کا حال پڑھ کر موسم کے بارے میں تقریر کرنے والے

گلیوں میں بہتی نالیوں کو دیکھنے کب آئیں گے۔

مجھے اگر یہ سب معلوم ہے

تو تمہیں کیوں معلوم نہیں

میں سچ کہتی ہوں

میں پیمبر نہیں ہوں

میں تو بس آج کو آنکھیں کھول کر دیکھ رہی ہوں[۲۹]

انتظار حسین نے کشور ناہید پر اپنے لکھے مضمون بعنوان "نئے زمانے کی برہن" میں لکھا تھا کہ

کشور ہمارے نئے زمانے کی عقل مند خاتون ہے۔ معصومیت کے اپنے دکھ ہیں۔ عقل مندی کی اپنی پریشانیاں ہیں۔[۳۰]

اور یہ واقعی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ ایک سوچنے سمجھنے والی عورت کے راستے میں ایک مرد کے مقابلے میں کہیں زیادہ مشکلات آتی ہیں۔ وہ ان کو خندہ پیشانی سے سہتی ہے اور تمام مسائل اور پریشانیوں کے درمیان سے اپنے جینے کی راہ نکال لیتی ہے۔

اس حوالے سے شمیم حنفی کا کہنا ہے:

اصل میں ہر انسان اور ہر عہد کی پہچان اس کے سوالوں سے ہوتی ہے یا اس بات سے کہ جواب کی جستجو میں ان سوالوں کی سمت کیا طے پاتی ہے۔ کشور ناہید کی شاعری جن سوالوں کا مرکب ہے، ان کی بساط ہمارا حال ہے اور اس کا سِرا وقت کے جس دوسرے منطقے سے جڑا ہوا ہے اس کی حثیت ایک امکان یا آئیندہ کی ہے۔ اس طرح یہ شاعری معاصر عہد کے مقبول اور مروج شعری ضابطوں کے برعکس محض ایک مخصوص انسانی صورتِ حال کی عکاس نہیں ہے۔ حاضر کے حوالے اس شاعری کے محرک کا رول نبھاتے ہیں اور تاریخ کے اس عمل کی نشان دہی کرتے ہیں جو کشور ناہید اور اس کے ہم عصروں میں ایک نوع کی ذہنی رفاقت کا سبب بنا ہے۔[۳۱]

کشور کے ہاں ان کے اپنے بنیادی تجربے کا واضح شعور نظر آتا ہے۔ وہ بنیادی تجربہ جو ان کی ذات کا Thesis ہے۔ اس کو پہلے درجے میں احتجاج اور دوسرے درجے میں بغاوت کہا جا سکتا ہے۔ اس بغاوت میں اذیت اور غصہ دونوں ہی شامل ہیں۔ بغاوت کا جذبہ ان ہی دونوں سے مل کر بنتا ہے۔ اذیت کا احساس اکثر خود اپنے آپ میں ہی مقید رہتا ہے۔ لیکن کبھی کبھار جھنجھلاہٹ کی صورت بھی اختیار کر لیتا ہے۔

وہ کہتے ہیں
میں درشتی اور سنگ دلی میں
ایک چٹان کی طرح ہوں
میں سوچتی ہوں
محبت اور طلب اور احتیاط
کے کٹوروں کو
چٹانیں کون کہہ سکتا ہے
میرا سارا بدن جل رہا ہے

میں اس آنچ کو ہونٹوں اور آنکھوں تک

نہیں پہنچنے دوں گی

میرے حلق کی چٹانیں

فصیل ہیں میرے جذبوں کی

تمہارے فیصلوں کے رڈار پہ

ان مورچوں کی خبر نہیں پہنچے گی [۳۲]

ہر جذبہ انسان کی اپنی شخصیت کے حوالے سے مفہوم اور سمت پاتا ہے۔ اگر یہ جذبہ محض خارجی حالات کا ردِ عمل ہے تو وہ نعرہ بازی پر مجبور کرے گا۔ لیکن اگر وہ شخصیت کا جزو ہے تو واردات کے امکان کا پتہ دیتا ہے۔ اور کشور کا تو کہنا ہی یہ رہا ہے کہ "بولنا ہماری ضرورت ہے چاہے زمین میں منہ دے کر ہی کیوں نہ بولنا پڑے۔" جو شخص منہ میں زبان رکھتے ہوئے اپنے یا کسی اور کے حق میں نہیں بولتا تو اس کا ضمیر اس کو ملامت کرنے لگتا ہے اور اگر وہ اس ملامت کو قبول کر لے تو وہ ملامت، ملامت نہیں بلکہ مزاحمت بن جاتی ہے۔

کشور نے ہمیشہ موضوعات کے انتخاب میں سلیقہ سے کام لیا اور کامیاب اظہار کے لیے ہئیت میں تنوع کی سعی کی اور اسالیب میں تجربات بھی کرتی رہیں لیکن ان کی شاعری کا محور و مرکز ہمیشہ عورت کی ذات رہی ہے۔ ان کی بعض نظموں میں "ماں" خاص مفہوم کی حامل علامت کے طور پر استعمال ہوئی ہے۔ دیکھیے نظم "ہڈ بیتی"

میری ماں

دھرتی سمان، دھیرج دھیرج

بِن محسوس ہی چلنے والی میری ماں

پانی سمان، ہولے ہولے

غم کی چٹانیں کاٹنے والی

میری ماں

چندا جیسی، بِن گھبرائے

سب گھٹنائیں سہنے والی

میری ماں

برکھا جیسی، بِن بتلائے

اپنا آپ گھلانے والی [۳۳]

کشور ناہید نے جب بھی ماں کا ذکر کیا تو ماں اور مامتا سے وابستہ روایتی انداز اور "ماں کے پیروں تلے جنت ہوتی ہے" جیسے کلیشے میں بات نہ کی بلکہ ہر نظم میں اس نے ماں کے حوالے سے جبر، ستم اور برداشت اور اس کے استحصال کی بات کی۔ اس سلسلے میں

یہ نظر "زخمی پرندے کی چیخ" قابلِ غور ہے:

دیکھ رہی ہماری ماں!

ہم نے دیش رنگ کو

سہاگ رنگ کر لیا

ہم نے دیش رُوپ میں

بھی رَین رنگ بھر دیا

ہم نے اپنے آنسوؤں کو

پھول رنگ دے دیا

ہم نے اپنے آنچلوں کو

رات رنگ کر دیا۔

دیکھ رہی ہماری ماں!

تیری عزتوں سے کھیلنے کا نام

ہے اگر بہادری، تو ہم کو بزدلی قبول

تیری کھیتوں کے بیچنے کا نام

ہے اگر تونگری، تو ہم کو عسرتی قبول

دیکھ رہی ہماری ماں!

ہمیں تو اپنا دودھ بھی نہ بخشیو

کہ ہم نے دیش رنگ کو

سہاگ رنگ لر لیا[۳۴]

ماں کے حوالے سے بیشتر شاعرات نے نظمیں کہیں اور کچھ بہت اچھی بھی ہیں لیکن اس ضمن میں کشور ناہید نے ماں کو علامت کا رُوپ دے کر اس سے جو تلازمات وابستہ کیے ہیں، ان کی بنیاد پر یہ نظمیں ایک خاصے کی چیز بن جاتی ہیں۔ ہر ایک لکھنے والے نے ماں کو اپنے اپنے اندازِ نظر سے دیکھا ہے مگر کشور کے ہاں یہ رنگ کیسا ہے، اس کے لیے نظم "اے کاتبِ تقدیر لکھ! کو دیکھتے ہیں:

میری جیسی ماں نے جنی تھی

ہیر، کہ جس نے زہر پیا

میری جیسی ماں نے جنی تھی

قرۃ العین جو کہلائی

جس نے علم کے سُوکھے پیالے کو تن زیب کیا

میری جیسی ماں نے جنی تھی

میرا بائی متواری

جس کے عشق کی گہرائی پیاس کو

پیمانوں نے لُوٹ لیا

میری جیسی ماں نے جنی تھی

نور جہاں، غم دیوانی

جس کے مزار پر پھول نہ پتی

میری جیسی ماں نے جنی تھی

نُوری، سسی اور سوہنی

اپنا آپ مٹا کے جنہوں نے

شہر وفا آباد کیا

لمبی کھجور سی شہزادی

جس کو تیغ کی آنچ نے جُھلسا

جس نے جیون وار دیا

میری جیسی ماں نے جنی تھی

مجھ جیسی بھی کوکھ جلی

قطرہ قطرہ زندہ رہ کر

جس نے موت کو مار دیا[۳۵]

کشور ناہید جس آسانی سے نظمیں کہہ لیتی ہیں اسی سہولت سے غزلیں بھی کہتی ہیں اور ان میں بھی وہی عصری شعور نظر آتا ہے۔ جو ان کی نظموں کی اساسی خصوصیت ہے:

چھپا کر رکھ دیا پھر آگہی کے شیشے کو
اس آئینے میں تو چہرے بگڑتے جاتے ہیں [۳۶]

بہت دنوں کی گھٹن شعر میں ڈھلی ناہید
بہت دنوں میں کھلا شہر میں دوانہ کہیں [۳۷]

میں اپنے ہی خورشید بجھا کر کہاں نکلوں
بے ماجرا ہونٹوں کو تو نوحہ نہیں ملتا [۳۸]

اس وقت میرے دیس کی عورت کے ہاتھ میں
خاکستری ردائے بریدہ بھی تیز ہے [۳۹]

"گلیاں دھوپ دروازے" کی یہ غزل بھی دیکھنے لائق ہے:

مکیں سے خالی مکانوں پہ سخت پہرا تھا
ہوا بھی کانپ گئی اس قدر اندھیرا تھا
ہم اپنے گھر میں پلے سرد مہریوں کے تلے
گھروں سے نکلے تو زہرابِ لب کا ڈیرا تھا
میری ہنسی کے صنوبر سے ڈر گئے وہ لوگ
کہ جن کے دل میں شبِ زہر کا بسیرا تھا
تمہیں تو یاد ہے سولہ برس کی وہ ناہید
نزاکتیں بھی عجب تھیں بدن چھریرا تھا [۴۰]

کشور کے ہاں ہر لفظ اپنے اندر بہت سے معنی سمیٹے ہوئے ہے۔ بہت سے ناقدین نے ان کی شاعری کو جدیدیت کا منبع قرار دیا ہے۔ وہ عورت جو پہلے کبھی زباں نہ کھولتی تھی اور اپنے اوپر روا رکھی گئی ہر زیادتی اور ظلم کو صبر شکر کر کے جھیل جاتی تھی یا قسمت کا لکھا کہہ کر ٹال جاتی تھی۔ اب اس کو زبان مل گئی اور اس نے آنکھیں کھل کر دنیا کو دیکھنا شروع کر دیا۔ آصف فرخی کو دیے گئے ایک انٹرویو میں کشور ناہید کا کہنا ہے:

> مائیں بے چاری پرورش کرتی ہیں اور اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کی ایسی تربیت کرتی ہیں کہ وہ اس مقام تک آ جاتی ہیں کہ بیٹے کو اُوپر کا سالن ملتا ہے، بیٹی کو نیچے کا۔ بیٹی کو جوتے پالش کرنے کو کہا جاتا ہے۔ اب اگر بیٹا بھی بیٹی کے جوتے پالش کرے تو I don,t mind کہ دونوں ایک دوسرے کا کام کر رہے ہیں۔ لیکن یوں خادماؤں کی ٹریننگ کرنے کا اسکول کھلا ہوا ہے ہمارے گھروں میں تو یہ ٹھیک نہیں ہے۔ پھر اس کے بعد عورتوں کے لیے جتنے تعلیمی منصوبے ہوتے ہیں ان میں صرف Vocational Training کے مراکز ہوتے ہیں۔ بھئی عورتوں کے لیے کیوں سوئی دھاگے کی غلامی آگئی؟ آپ اس کو برابر کے مواقع دیجئے۔ وہی Avenues کھولیے۔ اگر تعلیم ہے تو برابر کی تعلیم ہو اور اگر عملی صلاحیت ہے تو برابر کی عملی صلاحیت ہو۔[۴۱]

۸ مارچ ۱۹۸۲ء کو عورتوں کے عالمی دن کے موقع پر کشور نے ایک نظم کہی جو بقول شخصے پاکستان کی عورتوں کا قومی ترانہ بن چکی ہے۔ اس نظم کے ذریعے کشور نے اس پدرسری معاشرے پر گہری چوٹ لگائی ہے اور یہ واضح کر دیا ہے اب مزید خواتین دُشنام کے ڈر سے خاموش نہیں رہیں گی۔، نہ تو کسی ناجائز بات پر سر جھکائیں گی اور نہ ہی رسوائی کے ڈر سے ہاتھ جوڑیں گی:

یہ ہم گنہگار عورتیں ہیں
جو اہل جبہ کی تمکنت سے نہ رعب کھائیں
نہ جان بیچیں
نہ سر جھکائیں

نہ ہاتھ جوڑیں

یہ ہم گنہگار عورتیں ہیں

کہ جن کے جسموں کی فصل بیچیں جو لوگ

وہ سرفراز ٹھہریں

نیابتِ امتیاز ٹھہریں

وہ داورِ اہلِ ساز ٹھہریں

یہ ہم گنہگار عورتیں ہیں

کہ سچ کا پرچم اٹھا کے نکلیں

تو جھوٹ سے شاہراہیں اَٹی ملے ہیں

ہر ایک دہلیز پر سزاؤں کی داستانیں رکھی ملے ہیں

جو بول سکتی تھیں، زبانیں کٹی ملے ہیں

یہ ہم گنہگار عورتیں ہیں

کہ اب تعاقب میں رات بھی آئے

تو یہ آنکھیں نہیں بجھیں گی

کہ اب جو دیوار گر چکی ہے

اُسے اٹھانے کی ضد نہ کرنا

یہ ہم گنہگار عورتیں ہیں

جو اہلِ جبہ کی تمکنت سے نہ رعب کھائیں

نہ جان بیچیں

نہ سر جھکائیں

نہ ہاتھ جوڑیں![۴۲]

کشور ناہید نے کئی دفعہ یہ بات دہرائی کہ صرف ان پڑھ ہی نہیں بلکہ ہمارا ترقی پسند طبقہ بھی عورت کے باہر آنے اور مساوات کے مطالبے سے خوف زدہ ہو گیا ہے۔

ایک انٹرویو میں کہہ رہی ہیں:

> اس طبقے نے خوف زدگی کو فلسفے کا رنگ دے دیا ہے اور وہ فلسفہ یہ بیان کرتا ہے کہ بی بیو، تم ہمارے خلاف کچھ مت کرو۔ کچھ مت کہو۔ مرد کے خلاف کچھ مت کہو۔ اصل میں تم اس نظام کو بدلو۔ ہمارے خلاف کچھ مت کہو۔ ہم تو تمہارے ساتھ ہیں ۔ میں تو چاہتی ہوں کہ تم ہمارے ساتھ رہو۔ کیوں کہ اکیلی عورت کبھی بھی کچھ نہیں کر سکے گی جیسے کہ اکیلا مرد کچھ نہ کر سکا۔[۴۳]

خواتین کے مسائل کو سیاسی و سماجی سطح پر دیکھنے اور ان کے حل کے لیے عملی کوشش کرنے میں کشور ناہید جیسی خواتین کا دم غنیمت ہے جو نہ صرف عورتوں کے مسائل اور معاشرے میں ان کی حالتِ زار کو سمجھتی ہیں بلکہ اپنی پوری زندگیاں اس کے خلاف جہاد میں صرف کر دیتی ہیں۔

ب) فروغ فرخ زاد اور ان کی شاعری (سیاسی و سماجی تناظر میں)

بیسویں صدی کے وسط میں فروغ ایرانی ادب و شاعری میں ایک شعلہ جوالا کی مانند بلند ہوئی اور اپنے شعری جوہر سے ایران کے ادبی منظر نامے کو خیرہ کر دیا۔ ادیب اور دوسرے قارئین انگشت بدنداں تھے کہ اس اقلیم میں ایک نوجوان عورت کس طرح اچانک نمودار ہوئی اور چھا گئی اس کے کلام کی سحر بار نغمگی اس کا حیرت انگیز بے جھجک نسوانی اظہار، اس کی جرات اور خود اعتمادی اور انتہائی کھری سچائی جگر میں اترنے والی تاثیر کے ساتھ پڑھنے والوں کو مبہوت کر دیا تھا۔ اس نے باقاعدہ شعر گوئی اٹھارہ انیس سال کی عمر میں شروع

کی تھی اور جس وقت اس کی صلاحیتیں بام عروج پر تھیں تو اچانک کار کے ایک حادثے میں اس کا انتقال ہو گیا۔ عرفی، بائرن، شیلے، کیٹس اور فروغ اپنی جواں مرگی کے باعث ایک ہی صف میں جگہ پاتے ہیں۔

فروغ فرخ زاد ۱۹۳۵ء میں تہران میں کرنل فرخ زاد کے گھر پیدا ہوئی۔ وہ تیرہ چودہ برس کی عمر میں خوب غزلیں کہتی تھی مگر بعد میں اس نے غزل گوئی ترک کر دی۔ ہائی سکول کے بعد اس نے کچھ عرصہ مصوری اور سلائی کی تربیت بھی حاصل کی۔ سولہ برس کی عمر میں اس نے خود سے پندرہ سال بڑے ایک دور کے رشتہ دار پرویز شاپور سے عشق ہو گیا اور اس نے ماں باپ سے ضد کر کے شادی کر لی اور شاپور کے ساتھ ایران چلی آئی۔ ایک سال کے بعد اس کے ایک بیٹا پیدا ہوا جس کا نام کامیار رکھا گیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی شعر و سخن میں دلچسپی بڑھتی گئی اور اس کی ذہنی پختگی میں اضافہ ہوتا گیا۔ اس کا شوہر شاپور اس کی شاعری میں عشق و محبت کے بے باکانہ اظہار کو برداشت نہ کر سکے اور انہوں نے اسے طلاق دے کر اس کا بچہ چھین لیا جسے پھر شاپور اور اس کے خاندان والوں نے زندگی بھر فروغ سے نہ ملنے دیا۔ فروغ نے بچے کے لیے مقدمہ بھی لڑا مگر عدالت نے بچے کو باپ کے حوالے کر دیا۔

فروغ اپنے باپ کے پاس تہران آ گئی اور کچھ عرصے تک تہران میں رہنے لگی اس نے بیرون ملک سفر کئے اور انگریزی، فرانسیسی، جرمن اور اطالوی زبانوں پر اچھی خاصی مہارت حاصل کر لی۔ ۱۹۵۷ میں میں فروغ ایران کی فلمی صنعت سے وابستہ ہو گئی اور ۱۹۵۹ میں فلم کی تربیت حاصل کرنے کے لیے برطانیہ میں ایک سالہ کورس کیا۔ ایک فلم "خواستگاری" جس میں اس نے ایک رول بھی کیا۔ مفلوج، اپاہج اور کوڑھ زدہ لوگوں سے اسے بے انتہا پیار تھا۔ ان بدنصیب جزامیوں پر اس نے "خانہ سیاہ است" کے نام سے ایک فلم بھی بنائی۔ اس کی خواہش تھی کہ لوگ ان بے چہرہ لوگوں کی انسانیت تک رسائی حاصل کریں۔ اس لیے خواہشات کے لحاظ سے وہ بھی ہماری طرح کے انسان ہیں۔ جزامیوں کے بارے میں اس کی فلم انعام کی مستحق قرار پائی۔ ایک اور فلم "خشت و آئینہ" اس کے تعاون سے تکمیل پذیر ہوئی۔ ایرانی عورت کی زندگی پر اس نے ایک کہانی بھی لکھی جس کی وہ فلم بنانا چاہتی تھی جو نامکمل رہ گئی اس نے ایک ناول بھی لکھا جو مکمل نہ ہو سکا۔ وہ ایک ایسی با

صلاحیت اور شہرت یافتہ خاتون تھی کہ اقوام متحدہ کے ادارہ یونیسکو نے اس کی زندگی کے بارے میں آدھ گھنٹے کی فلم بنا کر اس کی صلاحیتوں کا اعتراف کیا۔ اس نے اٹلی کے دوسرے فلم فیسٹیول میں بھی شرکت کی اور وہیں پر انگلینڈ، فرانس اور جرمنی کی ادبی انجمنوں نے اس سے اس کے شعری مجموعوں کے ترجمہ اور اشاعت کی اجازت طلب کی۔ وہ تبریز گئی تو وہاں سے اس نے ایک بچہ بھی گود لے لیا جو کہ فروغ کی والدہ کے پاس رہتا رہا وہ اتنی محنتی اور کوشش و کار سے اتنی سرشار تھی کہ اس مختصر زندگی میں شاعری کے چار مجموعے یادگار چھوڑ گئی۔ ابھی اسے اور بھی بہت کچھ کہنا تھا مگر مرگ زود رس نے اس کی بات کاٹ دی اور ۱۹۶۶ میں گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے محض ۳۲ سال کی عمر میں وہ حادثے میں ہلاک ہو گئی۔

فروغ نے اپنی شاعری کے پانچ مجموعے شائع کئے۔ اسیر، دیوار، عصیاں، تولدیٔ دیگر اور ایمان بیاوریم۔

ان کا پہلا مجموعہ اسیر ہے جو ۱۹۵۵ء میں شائع ہوا تھا، اس وقت فروخ کی عمر صرف سترہ سال تھی، ان کے اِس مجموعے میں ۲۴ نظمیں شامل ہیں، اپنے اس مجموعے میں فروغ نے اپنی کچی عمر کے تجربات کا اظہار بہت بے باکی اور آزاد خیالی سے کیا ہے۔

عشق و محبت، جنس، رومان، عورتوں کے جذبات و احساسات، عورت کی محرومیاں اور عشق کے تلخ تجربات اس پہلے مجموعے کے اہم موضوعات ہیں۔

دیوار فروغ کا دوسرا مجموعہ کلام ہے جو ۱۹۵۶ء میں شائع ہوا تھا، اس مجموعے میں فروغ نے بنیادی طور پر عورت کو ہی اپنی نظم نگاری کا موضوع بنایا ہے۔ جنس اور عورت کے جذبات اِس مجموعے کے مرکزی موضوعات ہیں، دیوار میں فروغ سماج سے بے زار لگتی ہے اور خود کو شدید گھٹن میں محسوس کرتی ہوئی نظر آتی ہے، مجموعی طور پر دیوار میں ہمیں ایک ایسی عورت دِکھتی ہے جو سماج کی تمام پابندیوں اور روایات کو توڑ کر آگے بڑھنا چاہتی ہے۔ اس مجموعے کے شائع ہوتے ہی فروغ کی مخالفت میں ایک طوفان برپا ہو گیا۔ فروغ فرخ زاد کا تیسرا مجموعہ عصیاں ہے جو کہ ۱۹۵۷ء میں شائع ہوا ہے، یہ ایک، مختصر مجموعہ ہے جس میں صرف سترہ

نظمیں شامل ہیں۔ فروغ نے اپنے اِس مجموعے میں عشق، سماج سے بغاوت، عورت کے تشخص کی تلاش، خود انسان اور گناہ کو موضوع بنایا ہے، وہ خدا سے بھی شاکی ہیں کہ اُس نے تقدیر کا فیصلہ اپنے ہاتھ میں رکھ کر انسان پر بڑا ظلم کیا ہے، ان کو شیطان پر بھی ترس آتا ہے کہ وہ اگر شیطان ہے تو اِس میں اُس کا اپنا تو کوئی دوش نہیں ہے۔ فروغ فرخ زاد کا چوتھا مجموعہ تولدی دیگر ہے، اس مجموعے سے فروغ کی شاعری کے دوسرے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ مجموعہ ۱۹۶۳ء میں شائع ہو جب فروغ کی عمر ۲۹ برس تھی، اپنے اِس مجموعے میں فروغ نے جنس، عشق، تنہائی اور زندگی کی بے معنویت، ذات کی پہچان اور مرد کی سماج میں پہچان کو موضوع بنایا ہے۔

افسانوی طرزِ اظہار، ڈرامائی اندازِ بیان اور خود کلامی وغیرہ اس مجموعہ کلام کی بنیادی خصوصیات ہیں۔ بلا شبہ فروغ کے یہ پانچوں مجموعے ادب میں بہت گراں قدر اضافہ ہیں۔

اس کی شاعری میں اس کے گہرے مشاہدے، واردات قلبی کی شدت اور اس کی فکر کے مسلسل ارتقا سے اندازہ ہوتا ہے کہ فروغ نے انتہائی بے باکی اور سچائی سے وہ کچھ قلم بند کیا جو کہ اس کے دل پہ گزری۔

فروغ کی مختصر سی زندگی جو آج ہمیں شاید غیر معمولی معلوم نہ ہو پچاس اور ساٹھ کے عشرے میں ایرانی رسم ورواج سے طوفانی بغاوت سے عبارت ہے فروغ کی گھریلو زندگی، پیشہ ورانہ مصروفیات اور شاعری سب سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ایک آزاد اور ثابت قدم عورت تھی جس نے معاشرے کے طے کردہ ممنوعہ راستوں پر چلنے کی بجائے اپنا راستہ حیرت انگیز ذہنی آزادی کے ساتھ منتخب کیا۔

فروغ کی وفات کے بعد مینا اسدی نے اس کے گھر والوں سے ایک طویل انٹرویو لیا جس میں اس کے والد، والدہ، بہن پوران فرخ زاد، بھائی فریدون فرخ زاد سب شامل تھے۔ فروغ کب خاموش ہوتی تھی؟ کب غمگین ہوتی تھی، اس کا تکیہ کلام کیا تھا؟ لوگوں کے ساتھ اس کا میل ملاپ کیسا تھا اور ہر وہ بات جو فروغ کی زندگی سے منسلک تھی اس انٹرویو میں زیر بحث آئی۔ اس انٹرویو کے ذریعے فروغ کی شاعری اور شخصیت کو سمجھنے میں بہت مدد حاصل ہوئی۔ اس کو تفصیل سے پڑھنے پر یہ حقیقیت آشکار ہوتی ہے۔ کہ اس کے گھر والے اسے ابھی بھی مری ہوئی نہیں سمجھتے تھے بلکہ فروغ ان کے خیالات میں اور جذبات میں ابھی بھی زندہ تھی۔

فروغ کے باپ کرنل فرخ زاد نے اپنی یادیں تازہ کرتے ہوئے کہا:

> فروغ کی زندگی کے دو مراحل ہیں جب اس نے شعر لکھنا شروع کیا تو میں نے اس کی حوصلہ افزائی کی لیکن جب شاعری نے اس کی زندگی کو متنازعہ بنا دیا اور زندگی اس کے لیے سخت ہونے لگی تو مجھے برا لگنے لگا تھا کیونکہ میں سوچتا تھا کہ جس راستے کا انتخاب اس نے کیا ہے وہ اس کی عائلی زندگی کو متاثر کرنے کا باعث بن سکتا ہے اور میں اس بات پر کبھی مائل نہیں تھا کہ وہ اپنے شوہر سے جدائی اختیار کرے۔ لیکن وہ اپنے فیصلے پر اس قدر راسخ تھی کہ اس نے بالا آخر جدائی اختیار کر لی۔ اگرچہ ظاہری طور پر میں ناراض تھا لیکن اندر ہی اندر میں اس کی تعریف کر رہا تھا۔[۴۴]

جب فروغ کا شعر "گنہ کردم" شائع ہوا تو اس کے والد نے نہائیت غصے کا اظہار کیا۔ یہاں تک کہ فروغ کو گھر چھوڑنا پڑا۔ وہ اس وقت ایک ایسی عورت تھی جس کے پاس نہ گھر تھا، نہ پیسے، نہ نوکری، نہ تنخواہ اور نہ ہی کسی قسم کا جذباتی سہارا۔ فروغ کی پہلی کتاب شائع ہونے تک اس کی زندگی تھوڑی سی بہتر ہونے لگی۔ اس نے ایک معمولی کمرہ کرائے پر لیا اور کچھ ساز و سامان بھی خرید لیا۔ ان دونوں وہ اپنا گزارہ ایک ہفت روزہ میں کہانیاں چھاپ کر کرتی تھی۔ اور یہ سب اس لیے وقوع پذیر ہوا کیونکہ وہ اپنے باپ سے خائف رہتی تھی۔ اس وقت کے حالات اور مروجہ سماجی پابندیوں کی وجہ سے اس کے والد اس کو شاعری سے باز رکھنا چاہتے تھے لیکن فروغ پھر بھی اپنی شاعری کے ذریعے تمام رسم و راج اور پابندیوں کو نیست و نابود کرتی رہتی اور اپنی شاعری کے ذریعے بدرسری معاشرے کے پرخچے اڑا دیتی تھی۔

لبوں پہ مت لگا قفلِ خاموشی
کہ دل میں قصہ ناگفتہ ہے میرا
مرے پیروں سے یہ بندِ گراں کھول
کہ اب غم سے دل آشفتہ ہے میرا

ادھر آ مرد، اے موجود خود خواہ

ادھر اس قفس کا کھول دے در

گزاری عمر گر زنداں میں، میں نے

نفس بھر کے لیے مجھ کو رہا کر

پرندہ ہوں میں وہ جو مدتوں سے

ترستا ہے کرے پرواز اک بار

مرا نغمہ بنا سینے میں نالہ

بصد حسرت کروں آغازِ اِک بار

لبوں پہ مت لگا قفلِ خاموشی

مجھے کہنا ہے سربستہ ہے جو راز

کہ پہنچے گوشے گوشے تک جہاں کے

مری یہ آتشیں، پُر درد آواز

کروں پرواز میں، اب کھول یہ دَر

بہ سُوئے آسمانِ روشنِ شعر

کروں گر ترک میں پرواز اپنی

رہے مجھ سے معطر گلشنِ شعر

کتاب وخلوت وشعر وخموشی

مری ہستی ہیں، میری زندگانی

میں جنت میں نہ جاؤں، غم نہیں ہے

کہ دل میں ہے بہشتِ جاودانی

پرے کر یہ حدیثِ نام، اے مرد

ہے بدنامی میں لذت جاودانہ

خدا بخشے گا مجھ کو، وہ خداوند

دیا شاعر کو جس نے دل دِوانہ [۴۵]

فروغ نے ایک مردانہ معاشرے میں پرورش پائی ہے۔ اس نے ایک ایسے ملک و معاشرے میں آواز لگائی ہے جہاں عورتوں کی سوچ اور آگاہی کی صلاحیت ایک طویل عرصے تک مردوں کی سوچ کے زیر سایہ رہی ہے۔ فروغ سے پہلے ایرانی خواتین بذات خود اپنے حقیقی چہرے کو ظاہر کرنے میں کامیاب رہیں نہ کوئی دوسرا شخص معاشرتی روایات کے باعث ان کے مختلف پہلوؤں کی تصویر کشی کر سکا ہے۔ قدیم دور کے اشعار عورتوں کے احساسات اور ان کی نسوانیت کی نمائندگی نہیں کر سکتے تھے۔ قدیم دور کے اشعار میں عورت مکمل طور پر مردانہ تاویلات سے ہم آہنگ نظر آتی ہیں۔ اس دور میں کوئی خاتون شاعرہ نہ اپنی زنانہ تصویر یا صورت کو ان اشعار میں دیکھ سکتی ہیں نہ غزلوں میں مکمل طور پر مردوں کے بارے میں اپنی سوچ کو بیان کر سکتی ہیں۔

اسیر

میں تجھے چاہتی ہوں اور جانتی ہوں

کہ میری خواہشوں کی رسائی تیری آغوش تک کبھی نہ ہو گی

تو ایک صاف و روشن آسمان ہے

اور میں کنج قفس میں ایک اسیر چڑیا

ان سرد و سخت تیلیوں کے پیچھے سے

میں تجھے حسرت بھری بھی نظر سے دیکھتی ہوں

کہ کب تیرا ہاتھ مجھ تک پہنچے

اور میں تیری طرف پرواز کروں

میں سوچتی ہوں کہ صیاد کے اک لمحۂ غفلت میں

میں اس قفس سے خاموشی سے اڑ جاؤں

صیاد کی آنکھوں پر ہنسوں

اور تیرے پہلو میں آ جاؤں

میں سوچتی ہوں اور جانتی بھی ہوں

کہ قفس چھوڑنا میرے بس میں نہیں ہے

اگر صیاد رہا بھی کر دے

تو میرے پاس قوت پرواز نہیں ہے

ہر صبح تیلیوں کے پیچھے سے

ایک بچے کی مسکان مجھے دیکھتی ہے

جب میں کوئی خوشی کا گیت شروع کرتی ہوں

تو وہ ایک بوسہ میری طرف اڑا دیتا ہے

اگر یہ آسمان چاہے کہ ایک دن
میں اس قفس سے اڑ جاؤں
تو میں اس روتے ہوئے بچے سے کیا کہوں
کہ تو مجھے بھول جا، میں تو ایک اسیر پرندہ ہوں

میں وہ شمع ہوں جو اپنے جلنے سے
اس ویرانے کو روشن کرتی ہوں
اگر بجھنا چاہوں
تو اس کاشانے کی ویرانی مجھے روکتی ہے۔[۴۶]

فروغ کے اشعار پہلی بار فارسی شاعری پر مرد سالاری کے چھائے ہوئے گہرے بادل کو ہٹانے کی کوشش ہے۔ فروغ کی تحریک کی بنیادی وجہ "نیما" کے آثار اور نو آوری ہے جو انہوں نے شعری میدان میں رقم کیا ہے۔ نیما کی سوچ کے سائے میں فارسی شعر کو جدت ملی اور فروغ جیسی شاعرات نے اس میدان میں قدم رکھا ہے۔ فروغ فرخ زاد خود کہتی ہے:

> نیما میرے لیے آغاز تھا نیما ایک ایسا شاعر ہے جس کے اشعار میں مجھے پہلی بار سوچ و فکر کی فضا اور کمال انسانی نظر آیا اور میں نے فطرت کو کس طرح دیکھنا ہے سیکھا۔ میں نے اپنے پنجرے میں بیٹھ کر اس کی فکر اور سوچ کو اپنانے کی کوشش کی۔[۴۷]

فروغ اپنے معاشرے کو ایک انسان کی نظر سے دیکھتی ہے وہ اپنے معاشرے کا تجزیہ کرتی ہے اور پھر بے باک تنقید کرنا شروع کر دیتی ہے۔

دوسرا جنم

میری تمام ہستی تاریکی کی تمثیل ہے
جو تجھے اپنے اندر دہراتی ہوئی

ابدی شادابیوں اور تاریکیوں کی صبحوں کی طرف لے جائے گی

اس تمثیل کے اندر میں تیرے لیے آہیں بھرتی رہی، آہ!

میں نے اس تمثیل کے اندر تجھے

درختوں اور پانیوں اور آگ کے ساتھ پیوند کر دیا۔

زندگی شاید

ایک لمبی سڑک ہے جس پر ہر روز کوئی عورت ٹوکری اٹھائے گذر جاتی ہے۔

زندگی شاید

ایک رسی ہے جس کے ساتھ کوئی شخص ٹہنی سے لٹک جاتا ہے۔

زندگی، شاید کوئی بچہ ہے جو مدرسے سے گھر لوٹ آیا ہو۔

زندگی، شاید دو ہم آغوشیوں کے درمیان سست فاصلوں کے اندر سگرٹ سلگانا ہے۔

یا کسی راہرو کا گھبرائے ہوئے سڑک پار کرنا

راہرو جو اپنی ٹوپی اٹھا کر، بے معنی مسکراہٹ کے ساتھ

کسی دوسرے راہرو سے کہہ اٹھتا ہے: "صبح بخیر"

زندگی، شاید وہ بند لمحہ ہے

جس میں میری نگاہیں تیری آنکھوں کی پتلیوں کے اندر

خود کو برباد کر رہی ہیں۔

اور اس کے اندر ایک احساس ہے

جسے میں چاند کے ادراک اور ظلمت کے شعور کے ساتھ

ملادوں گی

ایک کمرے کے اندر، جو ایک تنہائی کے برابر ہے

میرا دل،

جو ایک عشق کے برابر ہے

اپنی خوش بختی کے سادہ بہانے ڈھونڈتا ہے

گلدان میں پھولوں کے خوبصورت زوال میں،

اُس پودے میں جو تُو نے ہمارے گھر کے باغیچے میں

لگایا تھا

اُن پرندوں کی آواز میں

جو ایک دریچہ بھر گیت گا رہے ہیں

میں اپنے ہاتھوں کو باغیچے میں بو دونگی

میں ہری ہو جاؤں گی، جانتی ہوں، جانتی ہوں جانتی ہوں!

اور ابابیلیں میری رنگین انگلیوں کے گڑھوں میں

بیج ڈال جائیں گی

دو سُرخ سُرخ چیریوں کے جوڑے سے

بالیاں بنا کر میں اپنے دو کانوں میں ڈال لوں گی

اور اپنے ناخنوں پر گلِ کوکب کی پتیاں چپکا لوں گی

اب بھی وہ گلی موجود ہے، جس میں اب بھی

وہ نوجوان جو مجھ پر عاشق ہوا کرتے تھے

اُنھی بکھرے بالوں، نازک گردنوں اور پتلی ٹانگوں کے

ساتھ اُس ننھی لڑکی کی معصوم مسکراہٹیں یاد کرتے ہیں

جسے ایک رات ہوا اُڑا کر لے گئی

اب بھی وہ گلی موجود ہے جسے میرا دل

میرے بچپن کے محلوں سے چرا لایا تھا۔

یونہی ہوتا ہے

کہ کوئی مر جاتا ہے

اور کوئی رہ جاتا ہے

کوئی شکاری اُس پایاب ندی سے جو کسی گڑھے میں

غائب ہو جاتی ہو، مرد وارید شکار نہیں کر سکے گا۔

میں ایک ننھی غم زدہ پری کو جانتی ہوں

جس کا گھر کسی بڑے سمندر میں ہے

اور اپنے دل کو کسی بنسری پر گاتی رہتی ہے

آہستہ آہستہ

وہ ننھی غم زدہ پری

جو رات کو ایک ہی بوسے سے مر جائے گی

اور صبح ہوتے ہی ایک بوسے سے جی اٹھے گی۔[۴۸]

فروغ پہلوی دور کی شاعرہ تھی اور اس نے عورتوں کے احساسات اور مردوں کے بارے میں عورتوں کی سوچ کے بارے میں بات کی؛۔ فروغ برملا کہتی ہے کہ:

میری خواہش اور آرزو یہ ہے کہ ایران میں عورتوں کو مردوں کے برابر حقوق ملیں۔ میں ایران میں اپنی بہنوں پر مردوں کی طرف سے ہونے والے ظلم و ستم اور نا انصافی سے بخوبی آگاہ ہوں یہی وجہ ہے کہ میں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ ان کی تکالیف اور دکھ درد کے خلاف آواز اٹھاتے ہوئے گزارا ہے۔ معاشرے میں خواتین لیے ہم آزادنہ اور سازگار ماحول کی فراہمی میری خواہش ہے۔[۴۹]

ایرانی خواتین اور حالت زار کو سمجھنے اور پرکھنے کے بعد فروغ "چابی کی گڑیا" جیسی نظم لکھتی ہے:

<u>چابی کی گڑیا</u>

اس سے بڑھ کر، آہ، ہاں،
اس سے بڑھ کر خاموش رہ سکتی ہے
پہروں، اس کی نگاہیں لاش کی ظروں کی طرح
ایک سگریٹ کے دھویں میں خیرہ ہوتی رہیں
ایک پیالی کی شکل سے محظوظ رہتی رہیں
یا قالین پر ایک بدرنگ پھول
یا دیوار پر ایک موہوم لکیر سے

خشک ہاتھوں سے پردہ ہٹا کر دیکھ سکتی ہے
گلی میں تیز بارش ہو رہی ہے

کوئی بچہ ایک رنگین غبارہ لیے

ایک طاق کے نیچے کھڑا ہے

ایک بوسیدہ گاڑی تیزی سے شور مچاتی ہوئی

خالی میدان سے جا رہی ہے

وہ بیٹھی رہ سکتی ہے اپنی جگہ پر

پردے کے پاس، مگر اندھی اور بہری

وہ چیخ سکتی ہے

نہایت جھوٹی، نہایت اجنبی آواز میں

"میں محبت کرتی ہوں"

ایک مرد کی چیرہ دستی کے آگے

ایک خوب رُو، سالم مادہ بن سکتی ہے۔

بڑی ہوشیاری سے تحقیر کر سکتی ہے

شگفتگی کے ہر معمے کی

اخباری معمے اکیلے ہی حل کر سکتی ہے

اور یک لغو حل پر اپنا دل خوش کر سکتی ہے

ایک لغو حل، چھ یا پانچ حروف کا

وہ تمام عمر دوزانو رہ سکتی ہے

سر جھکائے ہوئے، ایک سرد ضریح کے سائے میں

ایک مجہول قبر میں خدا کو دیکھ سکتی ہے

ایک ناچیز سکے سے ایمان حاصل کر سکتی ہے

کسی مسجد کے حجرے میں گل سکتی ہے

کسی بوڑھے زیارت نامہ خواں کی مانند

صفر کی طرح

تفریق و جمع و ضرب میں

تمام عمر ایک ہی حاصل پا سکتی ہے

اپنے غصے کے خول میں

کسی پرانے بدرنگ جوتے کا تکمہ چھپا کر رکھ سکتی ہے

پانی کی طرح اپنے گڑھے میں خشک ہو سکتی ہے

ایک لمحے کی خوشی کو، شرم سے

کسی سیاہ، مضحکہ خیز عکس کی طرح فوراً

صندوق کی تہہ میں چھپا سکتی ہے

ایک روز خالی دیوار پر

کسی محکوم یا مغلوب یا مصلوب کی تصویر ٹانگ سکتی ہے

تصویروں سے دیواروں کے رخنے ڈھانپ سکتی ہے

ان سے بھی پوچ تر نقوش میں گھل مل سکتی ہے

مٹی کی گڑیا کی طرح

شیشے کی آنکھوں سے اس دنیا کو دیکھ سکتی ہے

سالہا ایک مخملیں ڈبے میں

کاہی زدہ بدن کے ساتھ

پنیوں اور جھالروں کے ڈھیر میں خوابیدہ رہ سکتی ہے

اور ہر زہ دستی کی ہر چٹکی پر

بے سبب چیخ سکتی ہے

"آہ میں بہت خوش قسمت ہوں"[۵۰]

شاعری کی دنیا میں فروغ کی بغاوت دراصل احساسات اور عواطف پر مبنی ہیں۔ انہوں نے معاشرے میں رائج رسم روایت کے خلاف آواز اٹھائی ہے۔ یہ ایک عورت کی طرف سے عورتوں پر ہونے والے مظالم کے خلاف آواز تھی۔ دوسرے لفظوں میں وہ ایک روایت شکن اور باغی شاعرہ تھی۔ اخوان ثالث کے مطابق وہ عورتوں پر ہونے والے ظلم و ستم کے خلاف اعتراض کرتی تھی۔ اس کو اپنے معاشرے کی آدھی آبادی پر ہونے والے ظلم و ستم پر اعتراض تھا۔

براہنی کہتے ہیں:

> فروغ صدیوں بعد خاموش ایرانی عورت کی بولتی زبان تھی۔ وہ ایرانی عورت کی خاموشی سے تنگ آچکی تھی۔ فروغ کی شخصیت غم، تکلیف، دکھ اور احساسات کا متضاد مجموعہ ہے اور یہی متضاد خصوصیات نے ان کے شعر و شاعری کو پر رونق بنایا ہے۔ فروغ کے اشعار میں ایرانی خواتین کا مخفی چہرہ نظر آتا ہے۔[۵۱]

فروغ کی شاعری کی جمع پونجی اور اصل سرمایہ احساس ہے اور مختلف زاویوں اور اجزاء پر مشتمل اس کی شاعری کو یہ خصوصیت خاص مفہوم سے مالامال کرتی ہے۔ وہ اپنی بے زاری اور غم و غصہ کو ایک حساس لہجہ اور خلوص کے ساتھ ایک عورت کی زبان سے پیش کرتی ہے۔

ایک دردناک کہانی (افسانہ تلخ)

نہ ایسی کوئی امید جس سے دل بہلا سکوں
نہ کوئی پیام نہ کوئی پیام بر
نہ ہی کوئی ایسی آنکھ جس میں فتنہ ساز نظر ہو
نہ ہی کوئی موجِ صدا جس میں ترنم ہو

درد و ظلمت و نور و عشق کے شہر سے
صبح کے وقت اپنا دامن سمیٹتی ایک عورت گزری
گویا بھولا بھٹکا کوئی پرندہ
بدحال و ماندہ اپنے آشیانہ کی طرف گیا ہو
اس کے دکھ پر کس نے آنسو بہائے
اس کی زبان سمجھنے والا کون تھا
یہ انجان لوگ نہیں جانتے تھے
کہ اس کی پکار میں اس کے غموں کی گونج تھی

اپنی متحیر آنکھوں سے شاید وہ دیکھ سکے
امید آرزو کا پوشیدہ مرکز

پر افسوس تو یہ ہے کہ (کسی کی) آگ بھڑکا دینے والی دو آنکھوں نے

اس کو نشیب گناہ میں ڈال دیا

بجز ہوس کے اس سے اور کوئی سروکار نہ رکھا

اس میں سوائے جلوۂ ظاہر کے انہوں نے اور کچھ نہ دیکھا

وہ جس جگہ بھی گئی اس نے یہی سنا

کہ عورت کو خدا نے (مرد کے) تعیش کے لیے پیدا کیا ہے

کیوں۔۔۔۔۔۔وہ تو ایک پاکیزہ شبنم تھی

جو دامِ گل میں آ گری

اور صبح کو جب سورج نکلا

تو اس کے تشنہ حلق میں تڑپ کر اس نے جان دیدی [۵۲]

فروغ فرخ زاد نسوانی تجربات اور واقعات کو اپنا شاعری کا سرمایہ تصور کرتی ہیں انہوں نے اپنے احساسات کے ذریعے ملک بھر کی تمام خواتین کی نمائندگی کی ہے۔ فروغ مختصر مدت میں اور اپنے تین شعری آثار "اسیر، عصیان اور دیوار" کے بعد اپنے نسوانی احساسات کو گہرائی تک لے جانے اور ایک بلند پایہ شاعر کے مقام تک اپنے آپ کو پہنچانے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ ان کے اشعار میں انسان ناخوش اور زنانہ شخصیت کی صورت میں ملتا ہے اور وہ احساسات اور آرزو سے بھرپور نسوانی کردار میں ظاہر ہوتا ہے۔

سرگرداں (رمیدہ)

خدایا، میں نہیں جانتی کہ کیا چاہتی ہوں

ان راہوں پر صبح شام کیوں بھٹکتی ہوں

میری تھکی آنکھیں کیا ڈھونڈتی ہیں

میرا سوختہ دل کیوں اداس رہتا ہے

میں دوستوں سے بھاگتی ہوں اور

ایک خاموش اور ویران کنج میں پناہ لیتی ہوں

اپنے بیمار دل کی بات سنتے سنتے

میری نگاہ اندھیروں میں ڈوب جاتی ہے

میں ان لوگوں سے بھاگتی ہوں

جو بظاہر دوستی کا بھرم بھرتے ہیں

مگر باطن میں حقارت سے

مجھے بدنام کرتے ہیں"[۵۳]

فروغ کے اشعار میں احساسات اور چھونے کے قابل ایک الگ دنیا ہے جہاں جسارت، صداقت اور حقیقیت پائی جاتی ہے۔ان کو اپنے دور کا شگفت انگیز ترین شاعر زباں فارسی "۔یعنی فارسی زبان کی حیرت انگیز شاعرہ کا لقب دیا گیا ہے وہ ان شعراء میں سے ایک ہے جنہوں نے ایک نئی نظر اور دید سے انسان کو دیکھا اور اپنے اشعار میں انسان کا دوسرا رخ پیش کیا ہے۔

بہروز جلالی کے بقول:

> فروغ ایک ایسی شاعرہ جس نے اپنے نسوانی احساسات اور معاشرے میں موجود خواتین اور ان کے ان کہے احساسات کے درمیان گہرا تعلق پیدا کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے وہ اپنے دور کے انسانی احساسات سے معمور شاعرہ تھی۔ان کے اشعار اور ان کے نسوانی احساسات کے درمیان گہرا تعلق ہے۔[۵۴]

فروغ ان گنی چنی خواتین شعراء میں شامل ہے جنہوں نے اپنی شاعری کے ذریعے زنانہ پن یا نسوانیت کو مردانہ ذہنیت کے زیر سایہ تحفظ فراہم کیا اور اس کو ہاتھ سے کہیں جانے نہیں دیا۔ ایران کی سرزمین پر عورتوں کی سوچ اور فکر پر مردانہ سوچ کو فوقیت حاصل رہی ہے۔ تاریخ میں عورتوں کی سوچ پر مرد کے حاکم ہونے کی نفسیاتی برتری نے عورت کو شعر کے میدان میں نسوانیت اور زنانہ پن سے محروم کر رکھا تھا۔ ایران کی خواتین شعرا نے لاشعوری طور پر ملنے والی تاریخی تربیت سے متاثر ہو کر نسوانی احساسات کو ظاہر کرنے سے گریز کیا ہے۔

پرندہ فقط ایک پرندہ تھا

پرندے نے کہا: کیا دھوپ ہے، مہکار ہے

آہ!

بہار آئی ہے

اب میں اپنے جفت کی جستجو میں جانتا ہوں"

پرندہ بالکونی کی کگر سے

اُڑا، مثال پیامی،

اور چلا گیا

پرندہ جھوٹا تھا

پرندہ سوچتا نہ تھا

پرندہ اخبار نہ پڑھتا تھا

پرندے پر کوئی قرض نہ تھا

پرندہ انسانوں کی پہنچانتا نہ تھا

ہوا کے رُخ پر پرندہ

خطرے کے نشانوں کے اوپر

اپنے بے خبری کی رفعت میں اُڑ رہا تھا

اور نیلے لمحوں کا دیوانہ وار تجربہ کر رہا تھا

پرندہ آہ، فقط ایک پرندہ تھا۔[۵۵]

ایران نے اس کے حق میں جفا کی۔ شاعروں نے اس کی ہجو تک لکھ ڈالی۔ اس کے باوجود کسی بھی دوسرے معاصر شاعر کے مقابلے میں اس کے اشعار کا ترجمہ بہت سی زبانوں میں ہوا۔ اس کے اس کے اشعار جذبے اور خلوص سے لبالب بھرے ہوئے ہیں، اس لیے لافانی حیثیت رکھتے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ کشور ناہید، بری عورت کی کتھا، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۸ء، ص ۳۱

۲۔ ایضاً، ص ۹

۳۔ سید سبط حسن، نئے زمانے کی برہن، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۰ء، ص ۸

۴۔ کشور ناہید، دشت قیس میں لیلیٰ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۱ء، ص ۴۲

۵۔ ایضاً، ص ۱۵۸

۶۔ ایضاً، ص ۴۷

۷۔ ایضاً، ص ۱۵۷

۸۔ ایضاً، ص ۱۴۔۱۳

۹۔ ایضاً، ص ۲۰۔۱۹

۱۰۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، خواتین کی شاعری میں: عورتوں کے مسائل کی تصویر کشی، وزارت ترقی خواتین، اسلام آباد، ۲۰۰۵ء، ص ۹۱

۱۱۔ کشور ناہید، دشت قیس میں لیلیٰ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۱ء، ص ۲۴۔۲۳

۱۲۔ ایضاً، ص ۱۴۴۔۱۴۳

۱۳۔ شہرت بخاری، جاگتی گھڑیاں: نئے زمانے کی برہن، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۰ء، ص ۴۸

۱۴۔ کشور ناہید: دشت قیس میں لیلیٰ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۱ء، ص ۴۸۲

۱۵۔ گوپی چند نارنگ، پروفیسر، عورت مرد کا رشتہ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۰ء

۱۶۔ گوپی چند نارنگ، پروفیسر، آگہی، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۰ء، ص ۱۹۶

۱۷۔ کشور ناہید، کڑے کوس، دشت قیس میں لیلیٰ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۱ء، ص ۲۲۸۔۲۲۷

۱۸۔ شمیم حنفی، کشور ناہید: نئے زمانے کی برہن، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۰ء، ص ۱۰۴

۱۹۔ کشور ناہید، گھاس تو مجھ جیسی ہے: دشت قیس میں لیلیٰ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۱ء، ص ۴۷۲۔۴۷۱

۲۰۔ ایضاً، ص ۶۹

۲۱۔ کشور ناہید، بازگشت: دشت قیس میں لیلیٰ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۱ء، ص ۱۰۹۲۔۱۰۹۱

۲۲۔ اختر جمال، ناگفتنی: نئے زمانے کی برہن ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۰ء، ص ۱۵۲

۲۳۔ محمد حمید شاہد، دہشت کے موسم میں، کشور ناہید کی شاعری، لوح، شمارہ ہفتم و ہشتم، ۲۰۱۸ء، ص ۲۳۳

۲۴۔ کشور ناہید، نیلام گھر: دشت قیس میں لیلیٰ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۱ء، ص ۴۷۴۔۴۷۳

۲۵۔ زبیر رضوی، نئی عورت، نئی شاعری: نئے زمانے کی برہن، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۰ء، ص ۲۰۲

۲۶۔ کشور ناہید، مکافات: دشت قیس میں لیلیٰ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۱ء، ص ۴۷۰۔۴۶۹

۲۷۔ کشور ناہید، دھواں چھوڑتی بسیں: دشت قیس میں لیلی، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۱ء، ص ۵۰۱۔۵۰۰

۲۸۔ کشور ناہید، دفعہ ۱۴۴: دشت قیس میں لیلیٰ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۱ء، ص ۵۰۸۔۵۰۷

۲۹۔ کشور ناہید، تقریر نمبر ۲۷: دشت قیس میں لیلیٰ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۱ء، ص ۵۱۲۔۵۰۹

۳۰۔ انتظار حسین، نئے زمانے کی برہن ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۰ء، ص ۲۱

۳۱۔ شمیم حنفی، کشور ناہید: نئے زمانے کی برہن ، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۰ء، ص ۱۰۵

۳۲۔ کشور ناہید، سمجھوتہ: دشت قیس میں لیلی، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۱ء، ص ۴۸۴۔۴۸۳

۳۳۔ کشور ناہید، ہڈ بیتی: دشت قیس میں لیلی، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۱ء، ص ۵۶۳۔۵۶۱

۳۴۔ کشور ناہید، زخمی پرندے کی چیخ: دشت قیس میں لیلی، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۱ء، ص ۵۶۰۔۵۵۹

۳۵۔ کشور ناہید، اے کاتب تقدیر لکھ: دشت قیس میں لیلی، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۱ء، ص ۵۷۵۔ ۵۷۴۔ ۵۷۳

۳۶۔ کشور ناہید، لب گویا: دشت قیس میں لیلی، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۱ء، ص ۸۹

۳۷۔ کشور ناہید، ملامتوں کے درمیاں: دشت قیس میں لیلی، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۱ء، ص ۶۵۶

۳۸۔ کشور ناہید، سیاہ حاشیے میں گلابی رنگ: دشت قیس میں لیلی، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۱ء، ص ۹۹۶

۳۹۔ کشور ناہید، خیالی شخص سے مقابلہ: دشت قیس میں لیلی، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۱ء، ص ۱۱۶۸

۴۰۔ کشور ناہید، دشت قیس میں لیلی، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۱ء، ص ۵۸۸۔ ۵۸۷

۴۱۔ آصف فرخی، بانوئے گفت آشنا، نئے زمانے کی برہن ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۰ء، ص ۲۶۱۔ ۲۶۰

۴۲۔ کشور ناہید، ہم گنہگار عورتیں: دشت قیس میں لیلی، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۱ء، ص ۹۷۳۔ ۹۷۲

۴۳۔ آصف فرخی، بانوئے گفت آشنا، نئے زمانے کی برہن ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۰ء، ص ۲۶۹

۴۴۔ بہروز جلالی، جادوی جاودانگی، مروارید پریس، ۱۳۹۴ء، ص ۲۵۹

۴۵۔ فہمیدہ ریاض، بغاوت: کھلے دریچے سے، وعدہ کتاب گھر، کراچی، ۱۹۹۸ء، ص ۳۱۔ ۳۰۔ ۲۹

۴۶۔ بیدار بخت، اسیر: ایران کی باغی شاعرہ، فروغ فرخ زاد کا کلام، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۱۷ء، ص ۲۲۔ ۲۱

۴۷۔ علی باباچای، جریان ھای شعری از یہہ چھل تا امروز، ماہنامہ آدینہ، جلد ۲۵۔ ۱۳۶۷، ص ۶۵

۴۸۔ ن م راشد، دوسرا جنم: جدید فارسی شاعری، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۸۷ء، ص ۲۷۶ تا ۲۷۹

۴۹۔ سید ہادی، شاہکار شاعران ایران۔ زمان پریس، ۱۳۱۳ء، ص ۲۶۴

۵۰۔ فہمیدہ ریاض، چابی کی گڑیا، کھلے دریچے سے، وعدہ کتاب گھر، کراچی، ۱۹۹۸ء، ص ۱۰۷ تا ۱۱۰

۵۱۔ ناصر حریری، ہنر و ادبیات امروز، کتاب بسرای بابل، ۱۳۶۱ء، ص ۲۲

۵۲۔ پرتو روہیلہ، ایک دردناک کہانی: فروغ فرخ زاد کی نظمیں، زرنگار بک فاؤنڈیشن، لاہور، ۲۰۱۶ء، ص ۴۳ تا ۴۷

۵۳۔ بیدار بخت، سرگرداں، ایران کی باغی شاعرہ، فروغ فرخ زاد کا کلام، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۱۷ء، ص ۲۴۔۲۳

۵۴۔ بہروز جلالی، جادوی جاودانگی۔ مروارید ادیب پریس، ۱۳۹۴، ص ۳۵۷

۵۵۔ فہمیدہ ریاض، پرندہ فقط ایک پرندہ تھا: کھلے دریچے سے، وعدہ کتاب گھر، کراچی، ۱۹۹۸ء، ص ۱۴۸۔۱۴۷

باب سوم

کشور ناہید اور فروغ فرخ زاد کی شاعری کا جائزہ

(نفسیاتی و جنسی تناظر میں)

الف) کشور ناہید اور ان کی شاعری:

قدرت کی سب سے حسین اور معنی آفریں تخلیق عورت ہے۔ شاید اس لیے دنیا کی بیشتر شاعری کا موضوع عورت کی ذات ہے۔ خاص طور پر اردو ادب میں عورت ایک انسان سے زیادہ ایک شے بنا کر پیش کی گئی ہے۔ جاگیر دارانہ نظام کی شدت میں جکڑے مسلم معاشرہ میں عورت اگر بیوی بن کر اپنے وجود کا اثبات نہ کر پاتی تو پھر وہ محلات کی لونڈی بنتی ورنہ بازار حسن کی زینت۔ مسلم حکمرانوں کی تاریخ میں نور جہاں ممتاز محل، چاند بی بی یا حضرت محل ایسی شہرت یافتہ ملکائیں ملتی ہیں تو یہ صرف چند استسنائی مثالیں ہیں ورنہ باقی عورتیں محض عورتیں ہی رہیں۔ انفرادیت سے عاری اور تخلیق کے تدبر سے ناآشنا۔ جن کی شخصیت کا اظہار صرف ان کی تولیدی صلاحیتوں سے ہی ہوتا تھا۔

۱۹۳۰ء میں ترقی پسند ادب کی تحریک نے ادب میں کئی ٹیبوز توڑے چنانچہ اس تحریک میں عورت مرد کے شانہ بشانہ شاعری کرتی نظر آتی ہے۔ لیکن اظہار نسوانیت کیونکہ مروج ادبی فیشن کے خلاف تھا اس لیے شاعری میں عورت اپنی سائیکی کا اظہار نہ کر پاتی تھی۔

کشور ناہید نے اپنے ایک انٹرویو میں کہا ہے:

> میں تو بہت سی جگہوں پر بھول کر لکھتی ہوں کہ میں خاتون ہوں لیکن یہ کہ خاتون ہونے کی Obstacles اتنی ہیں، اتنی باتیں ہیں تو اس پوری سائیکی میں اور اس پوری غلامی میں پھر اور کیا ہو سکتا ہے۔[1]

کشور کے اکثر نقاد اسے روایتی مرد معاشرے کے خلاف ایک باغی اور سرکش شاعرہ قرار دیتے ہیں جو مظلوم عورت کی جنگ لڑ رہی ہے۔ لیکن کشور کی شاعری صرف روایتی مرد بالادستی کے خلاف ہی نہیں بلکہ اس سے آگے نکل کر پورے استبدادی معاشرے کو جمع کر رہی ہے۔ اس میں شک نہیں کے عورت کے ہونے کے ناطہ اس کا فوری اور قریبی ہدف مرد کی روایتی بالادستی کا وہ استحصالی نظام ہے جس میں ہماری عورت برسوں سے گھری ہوئی ہے۔ لیکن کشور کی شاعری کا دائرہ صرف نسوانی سرکشی تک ہی محدود نہیں بلکہ استحصال کے پورے معاشرے کو تبدیل کرنے اور طبقاتی نظام کی جڑوں کو ہلانے تک پھیلا ہوا ہے۔

کشور کے شعری سفر کا ارتقائی جائزہ لیا جائے تو ابتدائی زمانے میں بھی ان کے ہاں جنسی تموج میں خوابناک تصور پسندیدہ موضوع ہے۔ ان کی شاعری میں ایک مضطرب عورت کی تصویر موجود ہے جس کے اندر نفرت اور غصہ کا لاوا کھول رہا ہے۔ اس شاعری میں عورت کی جنسی زندگی کے علاوہ محبت، فرقت اور وصال کی کوشش میں نظر آتی ہیں۔ اس میں خود سپردگی بھی ہے مگر ساتھ ہی ساتھ ایک ایسی انسانی انا بھی سر اٹھاتی نظر آتی ہے جو عورت کو باندی یا مردوں کی داسی کی بجائے ایک خود مختار جذبوں کے ذریعے دیکھتی ہے۔

لب گویا کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے مختار صدیقی کہتے ہیں:

> یہ اپنی ذات کے علاوہ ایک پورے مرحلہ ادراک کا احاطہ ہے کہ اس مرحلہ میں اپنے وجود کے ساتھ ساتھ کسی ایک "وہ" کی ہمراہی اور اس کی حضوری کا احساس ہوتا ہے۔ کبھی "وہ" کوئی ہم نفس ہوتا ان معنوں میں ہم نفس کہ جس کی آرزو ہر صاحب معنی کو رہی ہے۔ کبھی کوئی دوست اور ہم سخن، کبھی محبوب، کہ ان احساسات کا وہی مرکز ہے۔ اور یہ احساسات کی جتنی بھی وابستگی ہے وہ اس کی بدولت ہے۔[۲]

کشور ناہید کی شاعری کا پہلا مجموعہ "لب گویا" ۱۹۶۹ء میں اشاعت پذیر ہوا۔ اس مجموعے میں پہلی مرتبہ ایک عورت کی شاعری نظر آئی۔ کشور ناہید نے اب گفتگو میں جس مردانہ انداز کو اپنالیا ہے۔ لب گویا میں اس کے آثار نہیں ملتے۔ لبِ گویا کی غزلوں میں اس کے لہجے میں کو ملتا ہے اور اظہار میں شرمیلا پن اور کچھ ان کہی کہہ دینے کی جھجک پائی جاتی ہے اسے لگتا ہے جیسے وہ آنچل سے سر کو خوب ڈھانک کر کھڑی ہے۔"

"دیکھ کر جس شخص کو ہنسنا بہت
سر کو اس کے سامنے ڈھکنا بہت [۳]

بے تابیوں کو سینے کے اندر سمیٹ لے
فتنے کو اپنی حد سے مسلسل بڑھا بھی دیکھ [۴]

پھر دل کو ہو گئی ہے وہی راہگزر عزیز
پھر آگئے فریب میں ہم مدتوں کے بعد [۵]

گھر کے اندر کاٹتی ہے یرگی
گھر سے باہر رہ کے بھی ڈرنا بہت [۶]

دل میں ہے ملاقات کی خواہش کہ دبی آگ
مہندی لگے ہاتھوں کو چھپا کر کہاں رکھوں [۷]

کشور ناہید ایک جگہ لکھتی ہیں:

ہر چند میں نے شروع میں بڑی بے ہودہ روایتی عورت کی نمائندگی میں غزلیں کہیں۔ [۸]

لیکن ایسا نہیں ہے۔ لب گویا، کی اشاعت کے وقت کشور ناہید کی عمر ۲۹ برس تھی مگر ان کے ہاں کسی بھی زمانے میں ٹین ایجرز کی جذباتی اور سنسنی سے بھرپور شاعری نہیں ملتی۔ ان کے ہاں عورت پن کے اظہار میں بھی ندرت اور ایج ملتی ہے۔

سُرخی بدن میں رنگِ وفا کی تھی کچھ دنوں
تاثیر یہ بھی اس کی دُعا کی تھی کچھ دنوں

ڈھونڈنے سے اس کے نقش الجھتے تھے اور بھی
حالت تمام کربُ و بلا کی تھی کچھ دنوں

کاغذ پہ تھا لکھا ہوا ہر حرف ، لب کُشا
تحریر، جسم، صوت و ادا کی تھی کچھ دِنوں

شاخوں پہ کونپلوں کو زبانیں عطا ہوئیں
یہ دلبری بھی دست صبا کی تھی کچھ دنوں

دل سوزی وفا کو شکیبائی کی عطا
شائستگی یہ رنگ حنا کی تھی کچھ دنوں

اب ہے کدورتوں کا کھلا دشت اور میں
چاہت تمام تیری رضا کی تھی کُچھ دنوں

کیفیتِ نشاط تھی خود ہی سے گفتگو
ناہید یہ ردا بھی حیا کی تھی کچھ دنوں[۹]

اپنی ابتدائی شاعری میں کشور ناہید محض ایک عورت نظر آتی ہے۔ کوئی انٹلیکچوئیل یا Activist نہیں۔

حوصلہ شرطِ وفا، کیا کرنا
بند مُٹھی میں ہوا، کیا کرنا

جب نہ سنتا ہو کوئی بولنا کیا
قبر میں شور بپا کیا کرنا

میرے پیچھے میرا سایہ ہو گا
پیچھے مڑ کر بھی بھلا کیا کرنا

کچھ کرو یوں کہ زمانہ دیکھے
شور گلیوں میں سدا کیا کرنا

درد ٹھہرے گا وفا کی منزل
عکس شیشے سے جُدا کیا کرنا

شمعِ کُشتہ کی طرح جی لیجے
دم گھُٹے بھی تو گلہِ کیا کرنا

دل کے زنداں میں ہے آرام بہت
وسعتِ دشت نما کیا کرنا[۱۰]

کشور کے ہاں ابتداء اسے ہی گہرائی میں جا کر دیکھا جائے تو جنسی تموج اور خواب ناک تصور پسندیدہ رہے ہیں۔ ایک ٹھہراؤ ہے لیکن ساتھ ہی ایک اضطراب کی زیریں لہر بھی موجود ہے۔

کہتے ہیں میں سوتے سوتے چلتی ہوں
ہنستا دیکھ کے لوگوں کو رو دیتی ہوں

گرمی کی بیکار دوپہروں میں اکثر
جلتی ہوئی زمین کی دھڑکن سنتی ہوں
جب میرا چلنے کو جی نہیں چاہتا ہے
پاؤں کی دیوار بنا کے بیٹھتی ہوں

کھال پرانی ہاتھ سے گرتی رہتی ہے
بات پرانی پیٹ میں پالتی رہتی ہوں

دیکھ کے باہر منظر نئے بلاوے کا
میں کھڑکی کو اینٹوں سے چن دیتی ہوں

فاختہ بن کر اڑنے کو جو جی چاہتا ہے
پر آ جائیں تو گھر میں چھپ جاتی ہوں

جاگتے میں لکڑی کی طرح سلگتی ہوں
اور سوتے میں چلتی ہوا سے لڑتی ہوں

اپنا نام بھی اب تو بھول گئی ناہید
کوئی پکارے تو حیرت سے تکتی ہوں"

عورت کے جذبات اور ایک خوابناک تصور کو مہمیز کرنے کے لیے محبت کا اظہار بہت ضروری ہوتا ہے۔ اسے صرف جنس کے پیمانے پر نہیں تولا جا سکتا۔ ڈاکٹر سلیم اختر 'ہیولاک ایلس' کی رائے سے استفادہ کرتے ہوئے کہتے ہیں۔:

اتنا کچھ لکھ جانے کے بعد بھی ابھی تک ہم اس مقام پر نہیں پہنچے کہ محبت کے وسیع تر
مفہوم کو سمجھ سکیں۔ تمام جذبات کی سرتاج محبت وسیع پیمانہ پر اظہار انانیت بھی تو ہو
سکتی ہے۔ اس لیے خواہ اس کے لیے کتنے ہی جواز مہیا کیوں نہ کیے جائیں۔ یہ کتنی ہی
اعلیٰ اور وقیع کیوں نہ ہو اس کا درجہ عام انا سے کسی لحاظ سے بھی بلند نہیں ہو سکتا۔ [۱۲]

بے نام مسافت اور ملامتوں کے درمیان کی نظموں میں فرسٹریشن اور اس کی پیدا کردہ تلخی واشگاف اظہار ملتا ہے وہ رفتہ رفتہ ان کے شعری مزاج کا حصہ بنتی رہیں لیکن بالکل آغاز میں بھی "نہ ہونے کا احساس" اور کچھ اور چاہے وسعت میرے بیاں کے لیے کا احساس بھی ملتا ہے۔

کشیدِ شب

آج کی رات بھی پھر خواب جگائیں گے مجھے
پھر وہ کروٹ سے خیالوں کے تسلسل کو مٹانے کی کشیدِ کوشش
جسم کے درد کو سلوٹ میں سمو کے
وہی بستر پہ تڑپتے ہوئے، ہجوری جاناں کو
کبھی آہ، کبھی سانس کی گہرائی میں، شل کرنے کی
سعیٔ ناکام
یہ بھی معلوم ہے
یہ نیم رسی، فہم کی دیوار تلک جست
یہ سائے کی تصویر، کسی شکل و شباہت کے تسلسل کے نشاں ہیں، لیکن
ناصبوری، یہ بدن توڑتی انگڑائیاں
ہونٹوں پہ مہکتی لرزش

بات کو ربط کے آہنگ میں لانے کی طلب

میرے سینے کا دھواں، آنکھیں شرابور کیے

ہر بن مُو کو ملاقات کا جویا کر دے

آنکھ چڑھتے ہوئے دریا کی طرح ہے پُر آب

پاؤں پھسلے ہے تو پھر سانس کا رشتہ نہ رہے

ہم تو جائیں مگر اس دل کو یہ اچھا نہ لگے

جاں کنی حد سے بڑھی چارہ گرہ، کچھ تو کرو![۱۳]

کشور ناہید کے ہاں جذبات کی آتشیں لے ہمیشہ آنچ دیتی دکھائی دیتی ہے۔ اس سے پہلے اپنی بے باکی سے کسی مشرقی شاعرہ نے (خاص طور پر اُردو شاعرہ) نے اپنے عشقیہ جذبات کو شاید ہی نظم کیا ہو عام طور پر نقاد فہمیدہ ریاض کی 'بدن دریدہ' کو اولیت دیتے ہیں لیکن کشور نے غالباً ایک سرکش لڑکی کے جنسی تموج اور خوابناک تصور کو سب سے پہلے پیش کیا تھا اور بحث یہ نہیں ہے کہ سب سے پہلے کس نے پیش کیا بلکہ بات صرف دیکھنے اور جاننے کی ہے کہ ایک تنگ و تاریک ماحول سے بنت حوا نے کیسے بغاوت کی ہے۔ اور اس کی داستان میں کشور ناہید کی شاعری کا عنوان ہے۔

باقر مہدی کا کہنا ہے:

> کشور ناہید کی شاعری اگر صرف اس کی ذات کی عکاس ہوتی تو وہ دلچسپ ہونے کے باوجود میرے لیے اتنی اہم نہ ہوتی۔ اس لیے کہ وہ صرف ایک عورت کی انفرادی سرکشی کی شعری روداد ہوتی۔ مگر کشور ناہید نہایت باشعور اور دنیا کی مختلف زبانوں کی شاعری کی جانکار بھی ہیں۔ وہ اپنے مرکز سے بہت دور کی آوازوں کو نہ صرف سنتی ہیں بلکہ جذب کرتی ہیں۔ آزادی نسواں کی جو تحریک مغرب میں زور شور سے چل رہی ہے اس کی اُردو شاعری میں مثال ان کی شاعری سے دی جا سکتی ہے۔ یہ مساوی

حقوق منوانے کے تحریک صرف سیاسی اور معاشی نہیں ہے بلکہ نفسیاتی اور جذباتی بھی ہے۔[۱۴]

ہمارے ماحول اور معاشرے میں لڑکیاں کمسنی میں ہی اپنے ماحول میں کی جبریت سے واقف ہو جاتی ہیں اور کشور کے ہاں ایسی لڑکی کی واضح تصویر نظر آتی ہے جیسے بارہا "نصیبوں جلی" کے طعنے دیے جاتے ہیں۔ ظاہر ہے وہ خود بھی اس کی نشانہ بنی ہوں گی مگر ان کی تیز نظروں نے معاشرے میں عورت کی ازلی اور ابدی مجبوریوں کو شروع دن سے ہی محسوس کر لیا تھا۔ یہی نہیں بلکہ انہیں ہمیشہ سے ہی رشتوں کی ناپائیداری کا بھی تجربہ تھا۔

تعبیر

وہی ہے شنگرفی رنگ سُرخیٔ غم کا
وہی ہے چاند کے چہرے پہ جانکنی کا حصار
وہی ہے زرّد روپتوں کے ٹوٹنے کا سفر
وہی دل میں تماشائے خستگی کی چُبھن
وہی ہے ٹھہر نہ سکنے کا زندگی کا چلن
وہی ہے فصل غم ناتمام کا عالم
وہی ہے صُبحوں کی تابندہ رنگتوں کی سبھا
وہی ہے جلتی دوپہروں میں عکسِ دل زدگی
وہی ہے قرمزی شاموں میں حدّتِ مثبت
وہی ہے ڈھلتی ہوئی رات اذنِ بے مایہ
وہی ہے قرب کی چاہت، سپردگی کی تڑپ

وہی فلک کی ہے رنگت وہی ہے راہگذر

مگر وہ شخص کہ جس کے لیے یہ سب کچھ تھا

وہ میرا نام درختوں پہ لکھ کر چھوڑ گیا[۱۵]

وولف گینگ لیڈر Wolf Gang leader نے کہا تھا کہ اکثر عورتیں اپنے کو مار کر آرٹ میں ڈھال لیتی ہیں تا کہ مرد اس کے فن کے قائل ہو جائیں۔ اس لیے ورجینا وولف نے کہا تھا کہ "اس سے پہلے کہ ہم عورتیں لکھنا شروع کریں یہ ضروری ہے کہ فرشتہ صفت شخص یعنی عورت کا وہ روپ جو مردوں نے اسے جبراً دیا ہے کو ختم کر دیں۔ اس کی وضاحت کرتے ہوئے ایک خاتون ناقد نے لکھا تھا کہ مردوں نے جو جمالیاتی آدرش بنا رکھا ہے اس کو مسمار کرنا ضروری ہے ورنہ ہمیں ہمیشہ ان کے بتائے ہوئے زینوں پر چڑھنا ہو گا اور ان کی خوشنودی کے لیے وہ آرٹ پیدا کرنا ہو گا جو انہیں مرغوب ہے۔ یہیں سے نسائی جمالیات کی ابتداء ہوتی ہے۔ اور یہاں سب سے پہلے اس عورت کو قتل کرنا ضروری سمجھا گیا ہے جو گھر کی رانی اور باہر کی چڑیل ہے۔

نسرین انجم بھٹی کا اس حوالے سے کہنا ہے۔:

> پورے اردو ادب میں عورت focused یا Exaggerated ہے۔ کہیں وہ صرف خوابوں میں ملنے والی ماورائی مخلوق ہے۔ کہیں پاؤں کی جوتی ہے، بے وفا ہے، طوائف ہے اور اپنی اصل میں صرف بدن ہے۔ بادی النظر میں یوں محسوس ہوتا ہے کہ اردو ادب میں عورت کو ایک ہی نظر سے ایک ہی رشتے سے دیکھا گیا ہے۔ اور وہ ہے جسم کا رشتہ۔ وہ لباس کے اندر بھی برہنہ ہے۔[۱۶]

یہ نظم ملاحظہ ہو:

روایت نہ ٹوٹے

ہم روایات کی کہنہ صدیوں کے پربت تلے

وہ گھنے سبز جنگل ہیں جو

بے پنہ شاخ درد شاخ تابندگی

تازگی کے تموج سے سنولا کے

خود ہی جھلس جائیں

ایسے جلیں ایسے جلیں

کہ فقط دُور تک کوئلہ کوئلہ ہی کھائی دے

اور تازگی کی نمو

خاک سے بھی گواہی نہ دے

وہ مقدر کے اچھے

کہ جن کو جلاپے کی مدت گزرنے پہ

ان کوئلوں کی جگہ، ہیرے موتی مِلے

وہ مقدر کے اچھے

کہ جن کی دُعائیں، زمیں کی تہوں میں دبیں

تو کہیں سونا چاندی بنیں

وہ مقدر کے اچھے

کہ جن کے بدن، کھولتے خوں کے چشمے تھے

اب بھی ہیں

پارے کی کانوں کی صورت کہیں

تو کہیں ایسے بھی سخت جانوں کے ہیں سلسلے جابجا

جن سے فولاد کا نام پائندہ ہے

وہ جلن جو کبھی تازگی کے تموج سے پیدا ہوئی

ہے مقدر کی تحریر ایسی کہ جس کی جلن ابتدا

انتہا بھی جلن

جلتے رہنے کا یہ سانحہ بھی جلن

انجمن، انجمن

چودھویں رات کے چاند نے بھی کہا

بھگی برسات کے رعد نے بھی کہا

تم وہی ہو کہ جن کو چٹخنے کہ مہلت بھی ملتی نہیں

اب روایت یہی ہے

نبھاؤ۔ ہنسو

مسکراؤ۔ جلو

مگر یاد رکھو

روایت نہ ٹوٹے

تموج کی ہر تازگی راکھ جھلسے

روایت نہ ٹوٹے[۱۷]

اردو ادب اپنی ترقی پسند تحریک اور جدید رجحانات کے باوجود نہایت دقیانوسی اور روایتی رہا ہے۔ خود ترقی پسند اور جدید ادیبوں اور شاعروں کی تحریریں عورت کی جذباتی اور معاشرتی کشمکش کو مسخ کر کے پیش کرتی رہی ہیں۔ وہ عورت جس کے جسم اور ذہن کی اہمیت کسی مرد کے برابر کسی نظم میں نہیں آئی اس لیے اردو شاعری کی تاریخ میں کوئی ایمیلی ڈکنسن یا اس طرح کی کوئی اہم شاعرہ نہیں ہوئی۔

باقر مہدی کہتے ہیں:

> ایک ماہر بشریات شیری اوٹنر نے سامنے کی بات کی کہ یہ سماج میں عورتوں کو زیادہ تر دو شکلوں میں پیش کیا جاتا ہے اور یہ علامتیں ہیں چڑیلیں، بدروح، مائیں، پریاں، مسیحاصفت پیکر، انصاف دہندہ خواتین یعنی سیاہ و سفید دونوں رنگوں میں مرد نے انہیں ڈھال کر عورتوں کو روپ بدلنے کی تلقین کی ہے۔[۱۸]

اردو ادب میں خواتین کم از کم ڈیڑھ صدی تک فعال رہی ہیں۔ اس کے باوجود عام ادیب کے لیے ادب ایک خالص مردانہ ڈبہ رہا ہے۔ حتیٰ کہ راجندر سنگھ بیدی جیسے بڑے ادیب اپنی پرانی موٹر گاڑی کے لیے ایسی عورت کی مثال پیش کرتے ہیں جس کا حیض و یض سب ختم ہو چکا ہے تو ان کے ذہن میں دور دور تک یہ خیال نہیں ہوتا کہ یہ جملہ کوئی عورت بھی پڑھ رہی ہو گی۔

فہمیدہ ریاض اپنے ایک مضمون میں کہتی ہیں:

> کتنی طویل مدت سے، عورتوں نے اپنے جسم اور اپنی بایولوجی کے لیے مقتدر ادیبوں کے یہ لغو اور بے معنی جملے پڑھے ہیں۔ کتنے برسوں سے ایک دبا ہوا اور کچلا ہوا غصہ ان کے سینوں میں کھولتا رہا ہے۔ مبارک ہے وہ دن اور ساعت جب صدیوں سے اہانت کا شکار یہ مخلوق لب کشائی کر رہی ہے۔ آج دانش ور عورت خوفزدہ نہیں۔ وہ پر اعتماد ہے۔ اور چند نہایت نامور ادیبوں کی تحریروں کو خود اپنے ہاتھ سے آئینہ کی طرح اٹھا کر دنیا کو دکھا رہی ہے اور ان تمام مقامات پر سرخ نشانات خود اپنے ہاتھ سے لگا رہی ہے جہاں مرد ادیب اپنی انسانی اقدار کا مضحکہ اڑاتے نظر آسکتے ہیں۔[۱۹]

کشور ناہید کا معاشرہ مشرق کا پس ماندہ علاقہ ہے جہاں غزل کی حکمرانی نے عورتوں پر تغزل کے دروازے اس طرح بند کیے تھے کہ وہ جان غزل بن سکتی تھی مگر خود غزل گو نہیں بن سکتی تھی۔ عورت کا جسم اس کی زندگی کا مرکز ہوتے ہوئے بھی محض جسم نہیں ہے بلکہ ذہن و جسم میں دوریاں قائم ہیں۔

کشور ناہید کیا کہتی ہیں دیکھیے:

میں کون ہوں

موزے بیچتی جوتے بیچتی عورت میرا نام نہیں

میں تو وہی ہوں جس کو تم دیوار میں چُن کے

مثلِ صبا بے خوف ہوئے

یہ نہیں جانا

پتھر سے آواز کبھی بھی دب نہیں سکتی

میں وہی ہوں رسم و رواج کے بوجھ تلے

جسے تم نے چھپایا

یہ نہیں جانا

روشنی گھور اندھیروں سے کبھی ڈر نہیں سکتی

میں تو وہی ہوں گود سے جس کی پھول چنے

انگارے اور کانٹے ڈالے

یہ نہیں جانا

زنجیروں سے پھول کی خوشبو چھپ نہیں سکتی

میں تو وہی ہوں میری حیا کے نام پہ تم نے

مُجھ کو خریدا مُجھ کو بیچا

یہ نہیں جانا

کچے گھڑے پر تیر کے سوہنی مر نہیں سکتی

میں تو وہی ہوں جس کو تم نے ڈولی بٹھا کے

اپنے سر سے بوجھ اتارا

یہ نہیں جانا

ذہن غلام اگر ہے قوم اُبھر نہیں سکتی

پہلے تم نے میری شرم وحیا کے نام پہ خوب تجارت کی تھی

میری ممتا، میری وفا کے نام پہ خوب تجارت کی تھی

موزے بیچتی جوتے بیچتی عورت میرا نام نہیں[۲۰]

جو محبوب اس معاشرے میں عورت کو میسر تھا جس کے تصور سے رعنائی خیال قائم تھی وہ محبوب صرف خواب کا سایہ ہے۔ زندگی کا کرب اٹھانے والا شخص نہیں ہے وہ ساتھ دینے ولا شخص نہیں ہے۔

اسی لیے مردوں کی اس دنیا میں کشور ناہید کو ادبی اہمیت حاصل کرنے کے لیے صرف شاعری ہی نہیں کرنی پڑی بلکہ پکوڑے بھی پکانے پڑتے ہیں۔

اس لیے تو وہ کہہ رہی ہیں کہ "اسیں بریاں وے لوکو":

فرد، اکائی، اکلاپا

لہر، دریا، سمندر، لہر

باہر بیٹھا کالا ناگ

اندر موت کا آوازہ

دل دروازہ

جھوٹی روٹی شکر خدایا

جیوے سائیں، کیا سکھ پایا

مٹی گارااور اینٹیں

سب ہیں جھوٹی بنیادیں

گھر والی، من دیوانی

آگ لگے، کہے دیوانی

فن پیاسی، گھر کی داسی

محل اداسی، بیر اگی

مَل آنکھیں، تو ہے جاگی

اندر موت کا آوازہ

باہر بیٹھا کالا ناگ[۲۱]

کشور ناہید نے اپنی آپ بیتی "بری عورت کی کتھا" کے نام سے شائع کی۔ یہ ایک ایسی کتاب تھی جس نے شعر و ادب کے ایوانوں میں ایک زلزلہ برپا کر دیا۔ بقول ڈاکٹر سلیم اختر:

> کشور ناہید کی آپ بیتی "بری عورت کی کتھا" شائع ہوئی تو یاروں نے کتاب کو ایسا دستر خوان جانا جس پر ان کی محروموں کی پیدا کردہ فینٹسی کی تسکین اور تشفی کے لیے بارہ مصالحہ کی چاٹ رال ٹپکانے کو سجی ہو گی مگر ہوا برعکس۔ بری عورت تو ایسی عورت نکلی جو مردوں کے ساختہ معاشرے میں اپنی شرائط پر زیست کرنے کی خواہاں تھی۔[۲۲]

کشور نے ہر حوالے سے عورت پر کیے گئے جبر، ظلم اور استحصال کے خلاف بات کی۔ اس پر کئے گئے مظالم پر احتجاج کیا۔ روایتی انداز اور بنے بنائے کلیشے نما تصورات کو رد کیا۔

آصف فرخی کو دیئے گئے ایک انٹرویو میں کشور کا کہنا ہے:

> میرا ایک نفسیاتی احساس کہ ہمارے محروم معاشرے میں مجھے کیا تمہیں مل رہا اور کیوں نہیں مل رہا اور مجھ سے مراد ہے میرا طبقہ میری کلاس جس میں عورت و مرد

دونوں شامل ہیں اب جیسا کہ ماؤنے کہا ہے کہ اگر مرد پر تین قدغنیں ہیں تو عورت پر
چار ہیں اور چوتھی قدغن مرد کی ہے جو انتہائی شدید ہے۔[۲۳]

کشور اپنی جرات اظہار پر نازاں ہیں اور اپنی نظموں میں اپنی نسوانیت اور اس کے حوالہ سے پاکستان عورت کو Explore کرتی محسوس ہوئی ہیں ایک بند معاشرے میں موجودہ جذباتی گھٹن، جنسی تشنگی اور ان سب کے نتیجہ میں تناؤ سے چٹختے اعصاب اسے اپنی شعری سفر کے نئے نئے عنوان مہیا کرتے ہیں۔ یہ عنوانات کشور ناہید کی تخلیقی شخصیت کی نفسی اساس بناتے ہیں اور جابجا ایسے کار آمد اشارے اور نفسی تلازمات ملتے ہیں جس سے کشور ناہید کے شعری پیکر کے خدوخال مزید نمایاں ہوتے نظر آرہے ہیں۔

گلاس لینڈ سکیپ

ابھی سردی پوروں کی پہچان کے موسم میں ہے
اس سے پہلے کہ برف میرے دروازے کے آگے دیوار بن جائے
تم قہوے کی پیالی سے اُٹھتی، مہکتی بھاپ کی طرح
میری پہچان کرلو
میں ابھی تک سبز ہوں
منہ بند الائچی کی طرح
میں نے آج، تمہاری یاد کے کبوتر کو
اپنے ذہن کے کابک سے آزاد کیا
تو مجھے اندر کی پتاورد کھائی دی۔
چاند پُورا ہونے سے پہلے تم نے مجھے چھوا
اور بات پوری ہونے سے پہلے

تم نے بات ختم کر دی

جانکاری کے بھی کتنے دکھ ہوتے ہیں

بن کہے ہی تلخ بات سمجھ میں آجاتی ہے

اچھی بات کو دہرانے کی سعی

اور بری بات کو بھلانے کی جدوجہد میں

زندگی بیت جاتی ہے

برف کی دیوار میں

اب کے میں بھی چنوا دی جاؤں گی

کہ مجھے آگ سے کھیلتا دیکھ کر

دانش مندوں نے یہی فیصلہ کیا ہے

میں تمہارے پاس لیٹی ہوئی بھی

پھلجڑی کی طرح سُلگتی رہتی ہوں۔

میں تم سے دُور ہوں

تب بھی تم میری لپٹوں سے سُلگتے اور جھلستے رہتے ہو

سمندر صرف چاند کا کہا مانتا ہے

سر شام جب سورج اور میری آنکھیں سرخ ہوں

تو میں چاند کے بلاوے پہ سمندر کا خروش دیکھنے چلی جاتی ہوں

اور میرے پیروں کے نیچے سے ریت نکل کر

مجھ زمین کر دیتی ہے

پیر بے زمین

اور سر بے آسمان

پھانسی پر لٹکے شخص کی طرح ہو کے بھی

یہی سمجھتی ہو

کہ منہ بند الائچی کی طرح ابھی تک سبز ہو[۲۴]

اور بقول ڈاکٹر سلیم اختر:

> کشور ناہید کی شاعری کو محض نظموں کی کشیدہ کاری نہ جانو، یہ تو قہوہ ہے۔ سبز الائچی جس میں مہک گھولتی ہے۔ لیکن یہ بھی یاد رہے کہ زیادہ الائچی منہ میں کڑواہٹ بھی پیدا کر دیتی ہے۔[۲۵]

کشور ناہید کے ہاں بے شمار ایسی نظمیں ملتی ہیں جن میں انہوں نے اپنے وجود، اپنی ذات، اپنی شناخت اور سب سے بڑھ کر اپنے عورت پن کی بات کی ہے۔ ان میں کہیں تو بہت واضح اور دوٹوک انداز پنایا ہے۔ اور کہیں بہت خوبصورت استعاروں اور امیجز سے کام لیا ہے۔ اور یوں کہ ریشم کے کیڑے کی طرح خود کو اپنی نرگسیت کے خول میں بند نہ کیا بلکہ نظموں سے اپنے وجود کی یوں توسیع کی کہ وہ عام عورت کی فرسٹریشن، آسودگی اور پیاس کی علامت بن جاتا ہے۔

<u>تم سے!</u>

اتنی گرمی

میرا تن اندر سے بھٹی

باہر ۱۱۷، ۱۲۰ کی گرمی

مہندی، لمحے بھر کو ٹھنڈک

بیچ ہتھیلی آن جگائے

پانی پنڈے پر ڈالو تو

آتی جاتی ٹھنڈک

روئیں روئیں میں

ٹھہر ٹھہر کے چین سجائے

ٹھنڈے پیٹ اور نرم کٹوروں

بیچ رکھے میں جاگے

دھوپ میں جیسے گیلے کپڑے

رات میں جیسے خواب کا نشہ

پھیلے پھیلے اور بھی پھیلے

ان چھوئی کلیوں کی دودھ سفیدی

جاگتی، بند ہوتی آنکھوں کی صورت

پھول میں ڈھلنے کو تڑپے تو

فاختہ جیسے بازو کھولو

انگڑائی کی گرمی تم سے نئی چنبیلی مانگ رہی ہے[۲۶]

کشور ناہید کے لیے اس کی ذات ایک قوی تخلیقی محرک کی حیثیت رکھتی ہے جس کے نتیجہ میں شاعری کے آئینہ میں اپنی تخلیقی شخصیت کو انہوں نے یوں سجایا اور وسنوارا کہ اپنے آپ پاکستانی عورت کی نفسیاتی و جنسی آرزو اور کشمکش کا سراپا بنا دیا۔ اس کے ساتھ ہی آزادی طلب عورت، اپنے وجود کا اثبات چاہنے والی

عورت، اپنی شخصیت کا اظہار چاہنے والی عورت اور اپنی نسوانیت سے نہ شرمانے والی عورت کا منشور بھی بنا دیا۔ ذرا یہ نظم دیکھئے:

تیر الٹیا شہر بھنبور

نیند نہیں آتی

بستر کی خواہش بھی آسودگی چاہتی ہے

میں ستارے گنتے گنتے

یہ سوچتی ہوں کہ ستاروں کی گنتی

تو تمہیں گلا گھونٹ کے مار ڈالنے کی گنتی سے کہیں کم ہے

تم میں بھی خواہش ہے

مجھ سے خوبصورت بنے رہنے

اور نت نئے ڈیزائنوں کے کپڑوں میں

لپٹے رہنے کی

کیلنڈر کی تصویر بدلی ہے

روز و شب کی تلخی نہیں بدلتی

روز، سہ پہر سے رات

قدموں کی چاپ کی بازیافت

یا ٹیلی فون کی گھنٹی سے

واپس آنے کی تسلی کے حروف کی اُمید میں

بسر ہوتی، منتشر ہوتی رات، اور پھر دن

کریز میں سجے دُھلے دُھلائے کپڑوں

کی طرح گزر جاتا ہے

سہ پہر سے رات

پھر وہی احساس

پھر وہی خواہش

تالے میں چابی گھومتی ہے

میں کروٹ بدل کر لیٹ جاتی ہوں

مرتبان میں بند

تتلی کی طرح،

صحرا میں گھومتے

اکیلے چیتے کی طرح،

مگر نیند نہیں آتی ہے[۲۷]

کشور ناہید کی یہ عورت روایتی مشرقی عورت کے آنسوؤں اور آہوں سے بھرے شاہکار کی طرح نہیں بلکہ بحیثیت عورت وہ خود پر ناز کرنے اور خود کو قابلِ احترام سمجھنے کی تلقین کرتی ہے۔

آصف فرخی کو دیئے گئے ایک انٹرویو میں کشور ناہید کا کہنا ہے:

جس جذبے کا اظہار میں اپنے انداز میں کر سکتی ہوں اس کو کرتے ہوئے جب میں لکھوں گی تو اس میں عورت کا اظہار ہو گا۔ عورت سے مراد خانوں میں بانٹنا نہیں ہے۔ بلکہ یہ وہ فرد ہے جس کی زباں سے آپ نے گیت لکھے جس کی زباں سے آپ نے پورا ادب تخلیق کیا وہ جب اپنی زباں سے کچھ کہہ کر ادب تخلیق کرتی ہے تو آپ

سنیں تو سہی۔ وہ جب راشد الخیری کی ہیروئین نہیں بنتی وہ جب ایسی صورتحال میں مبتلا ہوتی ہے تو اس کا ردِ عمل کیا ہوتا ہے۔ کیا بات کرتی ہے۔ کیسے اپنے تجربوں کو بیان کرتی ہے۔۔۔۔ مجھے زنجیروں میں بٹھا کر آپ اسے میری تقدیر کہیں میرے ساتھ جو منافقت ہو رہی ہے اسے غلامی کی تقدلیس کہنا، عورت کے سر نہ اٹھانے کو پاکیزگی کہنا۔ وہ ساری باتیں فیوڈل ضابطہ اخلاق کی جو ان لوگوں کو Suit کریں ان کو میری عصمت پروری کا نام دے کر میرے ساتھ جو دھوکا ہو رہا ہے اس کے بارے میں بیان کرنے کے لیے میرے پاس شاعری تھی اور میں نے شاعری کی۔[۲۸]

کشور ناہید بھی سیمون ڈی بوار کی مانند عورت کو Second Sex کے روپ میں دیکھنے کی روادار نہیں ہے۔ سیمون ڈی بوار نے فلسفیانہ سطح پر اپنی معروف تالیف Second Sex میں جس مسئلہ کو لیا تھا کشور ناہید تخلیقی سطح پر اسی سے نبرد آزما ہے اس لیے کہ اس کے ہاں عورت کی جنسی اور جنس کے ذریعہ عورت کی شکست یا پامالی ایک اہم موضوع کی صورت اختیار کرتی نظر آتی ہے۔

رات آتی ہے۔

دوبستر

ایک ہی کمرے ایک چھت کے سائے میں

ایک پہ بہتا نیند کا ساگر

ایک پہ بے خوابی کا صحرا

ایک پہ نرم ہوا کے جھونکے

ایک پہ لُو کے گرم تھپیڑے

دوبستر

ایک پہ تکیے کی آغوش کا گہرا بادل

ایک پہ شکنیں، اڈے دریا جیسی

ایک پہ خواب کی دیوالی اور دہکے ہونٹ

ایک پہ آنکھ کی ویرانی اور سوکھے ہونٹ

دوبستر

ایک پہ کروٹ، دریا ملے سمندر میں

ایک پہ کروٹ، نکلے آگ کہ جیسے پتھر میں

دوبستر

بیچ نہ ساحل

اور نہ صحرا

پھر بھی ڈونگا لمبا پینڈا[۲۹]

کشور ناہید کا یہی وہ باغیانہ شعری پیکر ہے جو اسے ملامتوں کے درمیان اپنے جسم و جان کی پوری توانائی اور تابناکی کے ساتھ متحرک اور زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ کشور ناہید ان دیواروں کی دشمن ہے جن میں باہر کی طرف کوئی کھڑکی نہیں کھلتی ہے وہ کھڑکی کھولتی ہے اور باہر سے آنے والے تیروں کو اپنے سینے پر جھیل جاتی ہے۔

Face the pan

انڈوں کی جگہ

ہونٹ تلنے کا تجربہ کیسا ہے

ہونٹ بھی انڈوں کی طرح

گرمی سے، بیک وقت

سُکڑتے اور پھیلتے ہیں

انڈوں کے چھلکوں کی طرح

ہماری شخصیت بھی اندر سے خالی

اور دو حصوں میں بٹی ہوئی ہے

مگر وہ تو عموماً برابر کے حصے ہوتے ہیں

اوہو! یہ برابری کا خواب

تمہیں باورچی خانے میں کیسے لے آیا ہے

انڈوں کے چھلکے تو ڈرائنگ روموں

میں بھی سج جاتے ہیں

تم کہاں سجو گی![۳۰]

کشور کے ہاں شعری واردات اپنی ذات سے شروع ہوئی تھی لیکن وقت کے ساتھ ساتھ اجتماعی اور معاشرتی واردات کی شکل اختیار کر گئی۔ ان کی پہلی بغاوت تو اپنے آپ سے ہی ہے۔ عورت ہونا خود ان کے لیے ایک واردات ہے لیکن اس نے اپنا اظہار شکست کے لہجے میں نہیں بلکہ نفرت سے غصے سے کیا ہے۔ پستی میں گری عورت کی کہانی بیان کرنا آسان کام نہیں ہے۔ اس کرب اور غم کا اندازہ وہی عورت لگا سکتی ہے جو خود اس صورت حال سے گزری ہو۔

-x+= -

ارے کیا ہوا

منہ پہ طمانچے کا نشان!

تنور میں روٹیاں یونہی لگتی ہیں

ارے کیا ہوا

گردن پہ گلا دبانے کا نشان!

بوتل کا رس تم پی سکتے ہو

ارے کیا ہوا

فقروں سے چھلنی ہو کر، ہونٹوں پہ پپڑیاں!

کمان سے تیر نکلے تو کسے خبر کہ کون نشانہ بنے گا۔

پیروں تلے جنت کی ہیروئن

لولی پاپ کی قیمت بڑھ رہی ہے

اور تیری گھٹ رہی ہے[۳۱]

ایک بڑے طبقے کو کشور ناہید کی شاعری کو قبول کرنے میں ہمیش دقت محسوس ہوئی کیونکہ انہوں نے ہمیشہ ایسے موضوعات چنے جن کا تعلق ایک عورت سے تھا یا عورت ہونے کے تجربے سے تھا یعنی ایسی وہ تمام چیزیں جو شاعری سمیت زندگی کے تمام شعبوں میں Taboo سمجھی جاتی رہی ہیں۔ یہ نظم بھی ان کی ذات وصفات کی مظہر ہے۔

کشور ناہید

عمر کے اڑتیس برس

تمہارے بالوں اور گالوں میں

"اترتی خزاؤں

اور ڈھلتے جذبوں کی آندھیوں میں

کچے ٹوٹتے پھلوں کی طرح

سارے رشتے

زندگی کے چندن روپوں کی طرح

گدرا گئے ہیں

کشور ناہید!

تم منہ بند سیپی کی طرح

زندگی کے سمندر میں

ہواؤں سے باتیں کرتے

پہاڑوں کی بنیاد ہلاتے

اور لہروں کو اپنے بالوں کی طرح کاٹ کر

ساحل پہ

گزشتہ کی روایتی

اور آج کی مضطرب

عورت بن کر سوچ رہی ہو

کشور ناہید!

یہاں نہ کوئی بولتا ہے

نہ کوئی بولتی آنکھوں کے

لفظوں کو سمجھنا چاہتا ہے۔

ہاتھ سے پھسلتی مچھلی

خوف کو نفرت میں بدل دیتی ہے

کشور ناہید!

تمہیں خاموش دیکھنے کی چاہت

قبروں سے بھی اٹھی آرہی ہے

مگر تم بولو!

کہ یہاں سننا منع ہے

مجھے جن جذبوں نے خوف زدہ کیا تھا

اب میں ان کے اظہار سے

دوسروں کو خوف سے لرزتا دیکھ رہی ہوں [۳۲]

اپنی شاعری سے کشور نے ہمیشہ کتھارسس کا کام لیا اپنی ذات اور شناخت کی پہچان کی۔ ایک جگہ لکھتی ہیں

> ہر نظم کی تخلیق میرے لیے بیک وقت سکوں کا لمحہ اور عذاب کی دہلیز ہوتی تھی۔ مجھے نظم لکھتے ہوئے اتنے امتحان اور اذیت سے گزرنا پڑتا تھا کہ ہر نقطہ میرے وجود کا خراج لے کر خود کو منکشف کرتا تھا۔ نظم لکھنے کے بعد جیسے نہائی ہوئی تر و تازہ، ہلکی پھلکی، کئی راتوں کی نیند جیسے پوری ہو گئی، کئی دنوں کی بھوک جیسے مٹ گئی۔ ہر کتاب کو مرتب کرنا بچے کی پیدائش جیسا مرحلہ لگتا رہا ہے۔ [۳۳]

دراصل یہی وہ پر تضاد صورت حال ہے جس سے عورت کی مخصوص نفسیات کا تضاد جنم لیتا ہے۔ اس تضاد کو کشور ناہید بہت بہتر طور پر سمجھ سکتی ہے کیونکہ وہ اپنے وجود میں اور شاعری دونوں میں Women Lib کی زندہ تصویر ہیں۔ اپنی بیشتر نظموں میں جیسے جاروب کش، کلیئرنس سیل کتنے چاہنے والے لوگ ترے دیوانے، اعتراف، میں کون ہوں، اے کاتب تقدیر لکھ، سن ری سہیلی میں وہ صدائے احتجاج بلند کرتی نظر آتی ہے۔

موم محل

میرے بیاہ سے پہلے میری ماں

خواب میں ڈر جایا کرتی تھی

اس کی خوفناک چیخوں سے میر آنکھ کھل جاتی تھی

میں اسے جگاتی ماجرا پوچھتی

اور وہ خالی آنکھوں گھورتی رہتی

اسے خواب یاد نہیں رہتے تھے۔

ایک رات خواب میں ڈر کر

اس نے چیخ نہیں ماری

خوف زدہ ہو کر مجھے اپنے ساتھ چمٹالیا تھا

میں نے ماجرا پوچھا

تو اس نے آنکھیں کھول کر شکرانہ ادا کرتے ہوئے کہا،

میں نے خواب میں دیکھا تھا

تم ڈوب رہی ہو اور میں نے تمہیں بچانے کو دریا میں چھلانگ لگائی ہے

اور اس رات بجلی گرنے سے

ہماری بھینس اور میرا منگیر جل گئے تھے۔

ایک رات ماں سو رہی تھی اور میں جاگ رہی تھی

ماں بار بار مٹھی بند کرتی اور کھولتی

اور یوں لگتا کہ جیسے کچھ پکڑنے کی کوشش میں تھک کر

مگر پھر ہمت باندھنے کو مٹھی بند کرتی ہے

میں نے ماں کو جگایا

مگر ماں نے مجھے خواب بتانے سے انکار کر دیا۔

اس دن سے میری نیند اڑ گئی

میں دوسرے صحن میں آ گئی

اب میں اور میری ماں دونوں خواب میں چیخیں مارتے ہیں

اور جب کوئی پوچھے

تو کہہ دیتے ہیں

ہمیں خواب یاد نہیں رہتے [۳۴]

اس فرسٹریشن کے ضمن میں نفسیانی سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ شاعر بھی سب آدمیوں جیسا ہی ایک آدمی ہوتا ہے لیکن شاید اس کا خمیر تھوڑا سا مختلف ہوتا ہے۔ یا اس کے اجزائے ترکیبی میں ایک عنصر کم ہوتا ہے۔ یا شاید ایک زیادہ کیونکہ اس کے اندر کبھی کبھی ایک لہر سی اٹھتی ہے۔ ایک ہوا سی چلتی ہے ایک باغ سا کھلتا ہے۔ اسی لہر کے زیر اثر وہ اپنا کتھارس کا عمل مکمل کرتا ہے۔

کشور ناہید کی شاعری سے بھی ان کی یقینی تصویر مرتب کی جا سکتی ہے۔ کیونکہ وہ آج کی شاعرہ ہے اور آج کی شاعرہ سچ بولتی ہے۔

ب) فروغ فرخ زاد اور ان کی شاعری (نفسیاتی و جنسی مسائل کے تناظر میں)

غمگین فروغ، ہشاش بشاش فروغ، شاعرہ فروغ، تنہا فروغ، فروغ فرخ زاد پر آج ادبیات نوحہ کناں ہیں۔ اس کی زندگی میں ابھرنے والے متنازعہ حوالات آج بھی زیر بحث ہیں۔ اس کی موت کے بعد کافی عرصہ تک ان موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی ہے اور یہی موضوعات ان کی ذاتی زندگی، اس کی شاعری اور زندگی کے دیگر پہلوؤں کا احاطہ کیے ہوئے ہیں۔ لیکن اصلی فروغ کو بہت کم لوگوں نے پہچانا ہے۔

پچھلی صدی کے وسط میں فروغ فرخ زاد جوالا نگاہ ادب میں ایک شعلہ جوالا کی مانند بلند ہوئی اور عین عالم جوانی میں جب کہ اس کی تمام صلاحیتیں منتہائے عروج پر تھیں۔ کار کے ایک حادثے میں اچانک ختم ہو گئی۔ اس نے مختصر عرصے میں اپنے شعری جوہر سے ایران کے ادبی سفر نامے کو خیرہ کر دیا۔ یہ بات درست ہے شاعری میں ان کی تاثر پذیری پر کافی زیادہ نکتہ چینی ہوئی اور بہت سے لوگوں نے اپنے اپنے ترازو میں ان کی شاعری کو تولنے کی کوشش کی مگر سولہ سترہ سال کی عمر میں ہی اس نے اپنے وجود کو دریافت کیا اور اپنے کلام میں دنیا سے زندگی کی نسائی تفہیم کی جو شعر وادب میں مردوں کی اجارہ داری کے تناظر میں حیرت انگیز تھا۔ ایک ایرانی نقاد کے بقول۔

> شاعری مرد کی زبان سے اس کی راز سن سن کر تنگ آچکی تھی۔ فروغ فرخ زاد کی زباں سے پہلی مرتبہ اس نے عورت کے راز سنے۔[۳۵]

فروغ کے کلام کے بے شمار محاسن ہیں اور اس کی ہر نظم میں ایک انوکھی خوبی اور جدت موجود ہے۔ اس کے لیے شاعری کوئی نقل نہیں تھی بلکہ اس کے روح اور قلب کی حقیقیت تھی وہ ایک ذہن اور گہرے مشاہدے کی حامل شاعرہ تھی۔ اس لیے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کے کلام میں فکری ارتقاء کا سفر نظر آتا ہے۔

آخری ہزار سالہ فارسی شاعری میں کہیں بھی عورت کو محبوبیت کا مقام حاصل نہیں ہوا۔ کہیں بھی یہ اہتمام روا نہیں رکھا گیا کہ عورت کی محبوب کی حیثیت سے بھی تشخیص ہو سکے۔ یہاں تک کہ حافظ جیسے غزل گو

کا محبوب مشخص نہیں۔ فارسی میں محبوب ہر کہیں مرد ہے۔ یہی نہیں بلکہ خود عورت کو بھی اپنی شخصیت کے اظہار کا موقع بہت کم ملا ہے۔ فارسی شاعری کی تاریخ میں خواش کی تعداد بھی زیادہ نہیں رابعہ بنت کعب، مہستی، قراۃالعین طاہرہ اور پروین اعتصامی ان میں سے صرف پروین اعتصامی کبھی کبھی عورت محسوس ہوتی ہے ورنہ عام طور پر ان شاعرات کی شاعری کے رابطے بالکل مردانہ ہیں۔ وہی رابطے جو پہلے سے معاشرت پر مسلط تھے۔ ان میں سے کوئی شاعرہ بھی معاشرتی روابط میں مردانہ تسلط کو رد نہیں کر سکی۔ تقلید کی روش سے آزاد نہ ہونے کے باعث ان کی شاعری میں نسوانی فطرت اظہار نہیں پا سکی۔ انہوں نے اجتماعی روابط کو مرد کی روایتی آنکھ سے دیکھا ہے۔

انور مسعود کہتے ہیں:

> فروغ فرخ زاد نے بڑے پر ہیجان انداز میں طوق تقلید کو گردن سے اتار کر پھینکا ہے۔ وہ عورت ہے اور اسے عورت ہونے پر فخر ہے۔ اور اس کے ہاں نسوانی آواز صاف سنائی دیتی ہے۔ اس اعتبار سے وہ بانوان ایران کی تاریخ ادبیات میں ایک نئے مکتب کی موسس قرار پاتی ہے۔ اس کی شاعری کی کونپل کسی اور شاخ سخن سے نہیں پھوٹی۔ اس نے اپنی شاخ پر اپنا پھول خود کھلوایا ہے۔[۳۶]

"اسیر" اس کا پہلا مجموعہ ہے جو اس وقت منظر عام پر آیا جب اس کی عمر ۱۷ برس تھی۔ نظموں کا یہ مجموعہ اس کی کچی عمر کے جذبات اور تجربات کے بے باک اظہار پر مشتمل ہے۔ اس مجموعے میں یوں لگتا ہے جیسے وہ اپنے وجود کو دریافت کر رہی ہے۔ شب و ہوس، ہرجائی، خاطرات اور اسیر نظموں کے عنوانات ہیں ان نظموں میں نسوانی حسرت کی عملی صورتوں کا تدریجی مطالعہ نہایت بے حجاب انداز میں کیا گیا ہے۔

اپنی ابتدائی شاعری میں وہ ایک باغی عورت کے طور پر سامنے آتی ہے۔ ایک ایسی عورت جس کے اندر ایک ایسی بے نظیر جسارت دکھائی دیتی ہے جو برملا عورتوں کے حوالے سے متعلق سماجی اقدار کو ٹھکرا دیتی ہے اور آزادی رائے کے لیے پوری عمر لڑتی ہوئی نظر آتی ہے۔ وہ اس لڑائی میں زندگی کی ہر چیز کو داؤ پر لگا دیتی ہے۔ اسے باپ کے گھر سے بے دخل کر دیا جاتا ہے لیکن پھر بھی وہ متعدد خطرات مول لیتی ہے۔

فروغ کی زندگی کا اگر تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک ایسی عورت تھی جس کی زندگی کی بنیاد ہی اس کی نسوانیت پر رکھی گئی تھی اس کی صرف یہ غلطی نہیں تھی کہ اس نے پورے معاشرے کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا بلکہ اس نے ایسی پر خطر کوشش کی جس میں وہ صرف اپنے آپ کو ایک عورت کے طور پر پالینا چاہتی تھی۔ وہ صرف ایک عورت تھی، وہ عورت جو ایرانی معاشرے میں کبھی بھی اپنا موزوں مقام نہیں پا سکی۔ وہ تمام عورتوں کی ترجمان کے طور پر اس پابندی کے خلاف فریاد کرتی ہے بغاوت کرتی ہے۔ اور روایتوں کی ہر بنیاد کو گرادیتی ہے اور اس طرح جدید ترین اور ماڈرن ترین ابتدائی شاعرہ کا لقب اپنے نام کر لیتی ہے۔

وہ نہیں جانتا کہ میں نے اپنے دل میں
اس کے عشق کی نشانی چھپا رکھی ہے
وہ نہیں جانتا کہ اس عشق نہاں نے
میری جان جلا رکھی ہے

مجھے اپنی نیک نامی کی اتنی فکر نہیں ہے
یہ میں ہوں جو تجھے اپنی تکمیل کے لیے کھوجتی ہوں
میں خلوت چاہتی ہوں ور تری آغوش
میں خلوت چاہتی ہوں اور ترے لبوں کے جام[۳۷]

فروغ کی شاعری میں ن کی تاثر پذیری پر کافی زیادہ نکتہ چینی ہوئی اور بہت سے لوگوں نے اپنے اپنے ترازو میں ان کی شاعری کو تولنے کی کوشش کی۔ لیکن فروغ ایک انسان کے طور پر ابھی تک پہچان کی محتاج ہے۔ ایک سادی انسان، معمولی انسان جس طرح وہ خود چاہتیں تھیں اور جس طرح وہ خود زندگی گزارتی تھی۔

روز اول یہ کہا خود سے
بس دوبارہ اب نہ ہو گی دید

روز دوئم پھر یہ دوہرا ہا
لیک با اندوہ وباتر دتد
روز سوئم بھی گیا پھر بھی
بر سرِ پیماں میں خود تھی
گھٹ رہی تھی سانس زنداں میں
اور زنداں بان میں خود تھی

مجھ میں اک دیوانہ باغی
کر رہی تھی گریہ زاروں ہزار
ڈھونڈتی تھی مل سکے روزن
سر پٹکتی تھی سرِ دیوار

کب سے غلطاں ہوں خیالوں میں
کون ہوں میں کہ نہیں سکتی
آہ کیا مغرور ہوں بے حد
یا ازل سے ہوں کوئی باندی

توڑ دوں پیماں اگر اپنا
پھر وہی غم مار ڈالے گا
پھر وہی امید ہے شاید
آخر اک دن وہ آئے گا"۳۸

جب فروغ کی سادگی کی بات ہوتی ہے تو بہت سے نقاد ان کی زندگی کا حوالہ دیتے ہوئے ابھی بھی سوال کرتے ہیں کہ کیا فروغ حقیقیت میں سادہ مزاج خاتون تھی؟ یہ کس طرح ممکن ہے جب کہ ان کے تحریری حوالوں میں متواتر بغاوت کا سراغ ملتا ہے۔

ایک جگہ وہ لکھتی ہیں:

> ہر کوئی اپنا زوج رکھتا ہے۔ ہمیں اپنی جوڑی خود تلاش کرتی چاہیے۔ جس کے ساتھ ہم زندگی بانٹ سکیں اور پھر مر جائیں۔ کیوں کہ زندگی کا مطلب سرزد ہونے والی غلطیوں کا خمیازہ بھگتنا ہے۔[۳۹]

ایک اور جگہ فروغ کہتی ہیں کہ زندگی صرف اور صرف غلطیوں کا جبر ہے۔ آخر کیسا نقص، کیسی غلطی، فروغ کس طرح کی غلطیوں کا خمیازہ بھگت رہی تھی اور اپنی غلطیوں کی اسے کیا قیمت ادا کرنی پڑی۔

تیس سال کی عمر میں اس نے یہ شعر لکھا:

مجھ سے گناہ سرزد ہو گیا ایک ایسا گناہ جو لذت آمیز تھا جب میں کسی کی گرم اور شعلہ و بانہوں میں تھی۔

جب سے شعر رسالہ میں شائع ہوا تو لوگوں کے فروغ کے ساتھ کیا کیا کیا، کیا کہا اور اس پر کیا بیتی۔

فروغ کی بہن پوران فرخ زاد نے مینا اسدی کو دیئے گئے ایک انٹرویو میں بتایا:

> جب یہ شعر رسالہ میں چھپا تو گھر میں بہت ہنگامہ کھڑا ہوا۔ اس شعر کے چھپنے کے بعد اس نے اپنا ساز و سامان اٹھایا اور باپ کے گھر کو چھوڑ کر چلی گئی۔ ایک کمرہ کرائے پر لیا اور وہیں زندگی بسر کرنے لگی۔ ان دنوں میں اس کے پاس ایک تکیہ بھی نہیں تھا۔ میں اپنے شوہر کے گھر سے خفیہ طور پر کچھ سامان اس کے لیے لے کر گئی۔ ہم اس کی مشکلات کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ ایک ایسی عورت جس کے پاس پیسے نہ ہوں گھر نہ ہو، نوکری نہ ہو تنخواہ نہ ہو، پہلی مرتبہ جب یورپ گئی تو فوجی جہاز سے گئی۔ اور اس کے

پاس صرف ۴۰۰ تومان تھے۔ گھر میں کبھی بھی کسی نے اس کا ساتھ نہیں دیا صرف
میری ماں جو ایک ماں کی طرح ان باتوں سے در کنار اپنے بچوں کے بارے میں سوچتی
رہتی ہے۔[۴۰]

فروغ کا خیال تھا کہ آج کا انسان بہت سعادت مند اور مہربان ہوتا اگر انسانوں کی تقدیر عورت لکھتی وہ کوئی ایسا جہاں بنانا چاہتی تھی۔ جس میں خون خرابہ ، جنگ و جدل نہ ہو تو ایسی دنیا کو وجود میں لانے کا ہنر صرف عورت ہی جانتی ہے۔ فروغ کے نزدیک زمین آسمان، بادل، ہوا، حتی کہ خود خدا عورت ہے۔

خدا کے روبرو

تاریکی کی اس مقید گلی سے
دنیا کے اس اندھیرے جوہڑ سے
میری یہ عاجزانہ پکار سن لے
اے قدرت رکھنے والے خدائے بے مثل

ذرا دیر کے لیے میرے جسم سے اتار دے
سیاہی کے اس غلاف کو
(پھر) شاید تجھے نظر آجائے
تباہی و گناہ کا سارا سرمایہ

اے خدا میں تجھے کس طرح بتلاؤں
کہ میں اپنے جسم سے کس قدر عاجز و بے زار ہو چکی ہوں
ہر رات تیرے آستانہ پُر جلال پر

ایک نئے جسم کی خواہش لے کر حاضر ہوتی ہوں

اور مجھے ایسا عشق دے

جو مجھے تیری بہشت کے فرشتوں کی طرح بنا دے

اور مجھے ایسا دوست عطا فرما

جس میں کچھ تیری خصلت کا رنگ بھی نظر آئے

اے اللہ تیرے ناتواں ہاتھوں نے

عالم ہستی کی بنیاد رکھی ہے

ایک دن اپنا چہرہ تو مجھے دکھا

اور پھر ہمیشہ کے لیے شوق گناہ اور نقش پرستی مجھ سے چھین لے

اس بات پر یقین نہ کر کہ ایک بندۂ چیز

بغیر تیری مرضی کے گنہگار ہو جاتا ہے

(اور) اس بات کو بھی نہ مان کہ اس کے آنسوؤں کا سیلاب

شراب کے جام کے قدموں میں برس جاتا ہے

تاریکی کی اس مقید گلی سے

دنیا کے اس اندھیرے جوہڑ سے

میری یہ عاجزانہ پکار سن لے

اے قدرت رکھنے والے خدائے بے مثل[۴۱]

فروغ کی ابتدائی شاعری میں ہمیں نسوانیت اور عورت کے وابستہ موضوعات ملتے ہیں۔ لیکن دوسرے دور کے آغاز میں وہ ترقی کر کے ایک عورت سے ایک انسان بن جاتی ہے۔ اب وہ معاشرے کو ایک عورت نہیں بلکہ ایک انسان کی نظر سے دیکھنے لگتی ہے۔ لیکن اسے اپنے عورت ہونے پر فخر ہے اور اس کے ہاں نسوانی آواز صاف سنائی دیتی ہے۔

انور مسعود کا کہنا ہے:

> اس میں کوئی شک نہیں کہ فروغ ہمہ تن خلوص شعر ہے۔ اس کی نہاد شاعرانہ ہے۔ اس کا دبستانِ سخن ایک صدرنگ تعزل زار ہے۔ ساز سخن پر اس نے عشق کا راگ چھیڑا ہے۔ خود سپردگی اور شوریدگی کے روپ میں ایک عاشقانہ نگرش (VISION) اس کی شاعری پر چھائی ہوئی ہے۔[۴۲]

عرفی، بائرن، شیلے، کیٹس اور فروغ اپنے ابتکار (ORIGINALETY) اور جواں مرگی کے باعث ایک ہی صف میں جگہ پاتے ہیں۔ فروغ ۳۳ سال کی عمر میں کار کے ایک حادثہ میں ہلاک ہو گئی۔ ۱۷ سال کی عمر میں اس کی شادی پرویز شاپور سے ہو گئی۔ ازدواجی زندگی دونوں میاں بیوی کو راس نہیں آئی اور ایک بچے (کامیار) کی پیدائش بھی اس بندھن کو مضبوط نہ بنا سکی۔ شادی کے محض تین سال کے بعد اس نے طلاق لے لی اس واقعہ پر اس نے خود صرف ایک جملے میں تبصرہ کیا۔

> میں نے شوہر کو چھوڑ دیا اور شعر کو اپنا لیا۔[۴۳]

۱۹۵۵ میں طلاق کے بعد واپس تہران جا کر فروغ نے یہ نظم لکھی۔

واپسی (بازگشت)

تیرے خط اور تلخ شکووں کی وجہ سے
میں تیری یاد میں رات گئے تک سو نہ سکی
اے میری امید کے چراغ، میری ڈھارس کے سہارے
ہرگز اس سے رنجیدہ نہ ہو جو میرے شعروں میں چھپا ہے

شاید مجھ میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ خاموشی سے

اپنے چھوٹے سے دل کی بات چھپا سکوں

بھول جا کہ میرے ترانوں میں کوئی راز ہے

بھول جا اس چھپی بات کو جو میرے شعر نے عیاں کر دی ہے

جب میں اپنے عشق کے ماضی پر نظر ڈالتی ہوں

تو یاد گمشدہ آفتاب کی طرح آتی ہے

ان شعروں نے مجھے کیا دیا

سوائے میرے محبوب کے درد کے

اس درد کو چھپانے کی طاقت

مجھ میں نہیں ہے

جن شعروں نے تجھے بہت دکھ دیا

وہ ایک مصیبت زدہ دل کی فریاد ہیں

میرے پیروں میں پھر سے بیڑیاں ڈال دے

تا کہ فتنہ و فریب سے میں مغلوب نہ ہو جاؤں

تا کہ رنگین جذبوں کے ہاتھ

پھر مجھے بے بس نہ کر دیں [۴۴]

فارسی شاعری کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ ایک عورت نے اس قدر شدید اللحن ہو کر مرد کے خلاف احتجاج کیا۔ یوں لگتا ہے کہ محبوب کی بے وفائی کے غم کا زہر اس کی رگ رگ میں اتر گیا ہے۔

سرد رات کی راہوں پر

مجھے کوئی افسوس نہیں ہے

میں اس کی سپردگی کو سوچتی ہوں

درد آلود سپردگی کو

میں بوسہ دیتی ہوں اس صلیب کو

جو میری قتل گاہ کے فراز پر گڑی ہے

سرد رات کی راہوں پر

جوڑے جدا ہوتے ہیں

مگر بے دلی کے ساتھ

سرد رات کی راہوں پر

صرف ایک آواز ہے

خدا حافظ، خدا حافظ

مجھے کوئی افسوس نہیں

ایسا لگتا ہے کہ میرا دل

زمانے سے دور ہے جائے گا

زندگی میرے دل کی بات کو دہرائے گی

میں تو ہو گئی ہوں

تو، جو کسی سے پیار کرتا ہے

ہزاروں نامعلوم چیزیں

دریافت کرتا ہے

غور سے سُن

میرے ہاتھوں کی آواز

اور مجھے ہاتھوں کی آواز

کہ میں پھر کیسے اپنے باقی ماندہ ہاتھوں سے

اپنے تاریک خوابوں کو چھوتی ہوں

مجھے کوئی افسوس نہیں ہے

میرے محبوب تو مجھ سے بات کر

میں سرد رات کی راہوں میں

ان ہی پیار بھری آنکھوں سے یاد کر

جن پر میرے بوسے ثبت ہیں[۴۵]

فروغ کی شاعری کی بقا کا راز دو نکات میں مضمر ہے۔ ایک اخلاص اور دوسرا اس کی شفاف زبان، اپنی پوری شاعری میں فروغ صرف فروغ ہی رہتی ہے۔ نہ تو وہ نقاب اوڑھنے کی قائل ہوتی ہے۔ اور نہ ہی دوسروں کے فاخرانہ لباس زیب تن کرنے کی عادی۔ نہ مصلحت سے کام لیتی ہے اور نہ ہی ایک کمزور اور ڈرپوک عورت

کی طرح پردے سے چھپ کر گفتگو کرتی ہے۔ فروغ اپنے ہر مصرعے میں جی رہی ہوتی ہے اور اس کا ہر شعر ہر بند ہمیں اس کی موجودگی کا احساس دلاتے ہیں۔

وصل

آہ وہ سیاہ پتلیاں

میرے معصوم خلوت نشین صوفی

اس کی آنکھوں کے جذبہ، سماع میں

بے حال ہوئے جاتے تھے

میں نے دیکھا کہ وہ میرے پورے وجود پر

موج در موج چھایا ہوا ہے

جیسے آگ کی سرخ آنچ

جیسے پانی میں عکس

جیسے بارش سے بوجھل بادل

جیسے گرم فصلوں کی گرم سانس سے بھرا آسمان

وہ زندگی سے بھی آگے تک

چھایا ہوا تھا

میں نے دیکھا کہ اس کے ہاتھوں میں

میرا سارا وجود

پگھلا جا رہا ہے

میں نے دیکھا کہ اس کا دل

اپنی پوری ساحری کے ساتھ

میرے دل میں گونج رہا تھا

میں نے دیکھا کہ میں رہا ہو گئی ہوں

چاند پر بہا اور چاند

ایک گڑھے میں جا گرا

ہم دونوں نے آنسو بہائے

اور اس لمحہ وحدت کو

ہم نے اپنے اندر سمو لیا[۴۶]

ڈاکٹر رضا براہنی "جاودانہ زیستن، درواج ماندن" میں لکھتے ہیں:

> فروغ فرخ زاد کی شاعری کا ماحول احساساتی اور فلسفی ہے۔ اس طرح لگتا ہے کہ فروغ اپنے ہر شعر میں ایک فلسفہ کے طور پر فکر میں ڈوبی ہوئی ہے۔ اگرچہ اس کا فلسفہ ایک خاص فلسفہ ہے کہ عام۔ جو چیز اس کے فلسفے کو خاص بناتی ہے وہ فروغ کی عورت کے حوالے سے اس کی جذباتی نگاہ ہے۔[۴۷]

فروغ، شاعری اور زندگی ایک دوسرے کے لیے ناگزیر تھے۔ اس کی شاعری ایک نوجوان، البیلی اور نٹ کھٹ حسینہ کے دل کی محبت بھری آواز ہیں۔ کچے خواب دیکھنے کی اس عمر میں وہ اپنے احساسات اور جذبات کا برملا اظہار کرتی دکھائی دیتی ہے۔ یہ خواہشیں کبھی بر آئیں اور کبھی نامراد ہونے کی صورت میں بھی اس نے اپنی سسکیوں کو روکنے کی کوشش نہ کی۔

ڈاکٹر انجم طاہرہ کہتی ہیں:

فروغ کے ارمان پُر ہیجان اور مضطرب تھے جو ایرانی رکھ رکھاؤ اور رسم و رواج کے لیے قابلِ قبول نہ تھے۔ اس لیے اس کو سراہا تو بہت گیا اور شاعرانہ حیثیت کو بھی تسلیم کیا گیا، مگر اس کی شاعری میں لفظوں اور جذبوں کی عریانی کی مذمت کی گئی۔ حالانکہ اس نے فطری جنسی خواہشات کا بلند بانگ اظہار کیا۔ عصمت چغتائی کی طرح وہ نوجوانوں کی مقبول شاعرہ بن گئی لیکن پروین شاکر سا نصیب لے کر اس جہان سے رخصت ہو گئی۔[۴۸]

فروغ ایک ایسی بے مثال شاعرہ ہیں جو بے ساختگی، سادگی اور عشقیہ واردات کے بیان میں منفرد حیثیت کی حامل ہیں۔ ان کے اشعار میں موسیقیت فطری ہے جو کم کم کسی شاعری کو نصیب ہوتی ہے۔

سپیدہ عشق
آسماں، جیسے میرا صفحہء دل
جلوہءماہ سے درخشاں ہے

آج شب نیند سے گریزاں ہوں
نیند سے تیرا خواب اچھا ہے

وحشی بیدوں کے سائے میں خیرہ
اُٹھ رہی ہوں سکوتِ بستر سے
گنگناتی ہوں اک سہانا گیت
اور سر رکھ دیا ہے کاغذ پر

میری آواز کی صراحی میں

آج صد ہا ترانے رقصاں ہیں

میری رگ رگ میں کن انوکھی سی

لذتوں کے خزانے رقصاں ہیں

آہ! گویا کہ کوچہء دل میں

روحِ شب گردِ کہر گزری ہے

یا نسیم بہار اس رہ پر

نرم رو عطر بیز گزری ہے

میرے سینے میں آج ایک ستار

کوئی انجان شے بجاتی ہے

شعر ہوتا ہے اس طرح موزوں

ساتھ میں بوئے عود آتی ہے

کر نہ سکتی تھی میں کبھی باور

یہ ملاقات بھی کہیں ہو گی

اور تیری وہ چشمِ شور افگن

مجھ پہ یوں گرم و دلنشیں ہو گی

بے گماں خواب کے جہان سے آج

مجھ پہ واہو گیا ہے دیدہء عشق

کیوں نہ پھر میں لکھوں یہ کاغذ پر

"جاوداں باشی اے سپیدہء عشق"[۴۹]

تصویر کشی، تازہ مضامین اور تخلیقِ معانی میں اس کی شاعری کسی طور بڑے شعراء سے کم نہیں ہے۔ وہ اپنے چاہنے والوں کے سامنے دو رُوپ لے کر آتی ہے۔ پہلے روپ میں وہ ایک شوخ اور الہڑ بے باک حسینہ دکھائی دیتی ہے جو نسائیت کا حسین ترین روپ ہے۔ پھر تولدیء دیگر کے بعد گویا واقعی اس کا دوسرا جنم ہوتا ہے اور وہاں اس کے الفاظ و کلمات میں پختگی دکھائی دیتی ہے۔ اس کے تمام مجموعہ ہائے شعر میں جو الفاظ نمایاں ہیں یا جن سے اس کے حساس اور سوز بھرے دل کا حال معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہیں:

شب، دل و قلب، عشق، گور، مرگ، بوسہ، گناہ، امید، آغوش۔ یہ تمام الفاظ اپنے اندر معنی کا ایک سمندر سمیٹے ہوئے ہیں۔

گزراں

کب تلک چلے کوئی

کب تلک کرے تلاش

اک دیار دوسرا

پھر دیار دوسرا

میں نہ ڈھونڈ پاؤں گی

بار بار، ہر دفعہ

کوئی عشق دوسرا

کوئی یار دوسرا

کاش ہوتے ہم پرند

اور اپنی منزلیں

ساری عمر، ساری عمر

ایک مرغزار سے

مرغزار دوسرا

جانے کب سے تیرگی

برس رہی ہے ابر سے

گھُل رہی ہے ہر خواب و خیال میں

میرے لب پہ تیرے بوسے

اس طرح ہیں، اس طرح

دھیرے دھیرے جیسے عطر ہو فنا

ٹھہر، بھول جاؤں میں

کیا ہے تو

صرف ایک لمحہ، جو میری نظر

بسطِ آگہی کی سمت کھول دے

ٹھہر، بھول جاؤں میں[۵۰]

فروغ رنگوں سے باتیں کرتی ہے، خیالوں اور خوابوں کی دنیا میں مست رہتی ہے اور عشق کی طراوت کو لمحہ بہ لمحہ شاعری کا روپ دیتی دکھائی دیتی ہے۔ وہ محرابِ عشق کی دہلیز پر ماتھا ٹکائے دعا کناں ہے۔

ڈاکٹر انجم طاہرہ لکھتی ہیں:

> فرزانہ میلانی نے فروغ اور اس کی شاعری پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ فروغ پہلی شاعرہ ہے جس نے شعری رسم ورواج اور فرسودہ روایات کی قدیم فصیلیں گرائی ہیں اور پہلی مرتبہ مرد کو شاعری میں بعنوان معشوق شامل کیا ہے۔ اس عظیم شاعرہ نے اپنے لیے تنقید کے خطرات مول لیے۔ ایرانی اس کو برے ناموں سے یاد کرنے لگے۔ فروغ کی اچانک موت ایرانی معاشرے پر ایک چوٹ ہے۔ اس کا کلام لافانی اور ابدی حیثیت حاصل کر چکا ہے۔[۵۱]

گویا فروغ بیک وقت طلب و اطمنان اور حسرت و اضطراب کی تصویر ہے۔ اس کی شاعری میں تشنگی اور سیرابی کی کیفیت یکساں عروج پر ہے۔ تشنگی بھی ایسی گویا لذتِ دیدار سے سیراب ہونے سے پہلے ہی ہجر کی صلیب پر چڑھا دیا گیا ہو۔ ہیجان انگیز ارمان دل میں لیے وہ اس دنیا سے رخصت ہو گئی اور اس کا جینا تو تلخ تھا ہی مرنا بھی غم انگیز ثابت ہوا۔

حوالہ جات

۱۔ رشید امجد، کشور ناہید۔ ایک چیلنج، نئے زمانے کی برہن، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۰ء، ص ۲۰۵

۲۔ ایضاً، ص ۲۰۷

۳۔ کشور ناہید، دشت قیس میں لیلیٰ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۱ء، ص ۵۳

۴۔ ایضاً، ص ۱۷

۵۔ ایضاً، ص ۵۱

۶۔ ایضاً، ص ۵۴

۷۔ ایضاً، ص ۱۰۵

۸۔ آصف فرخی، بانوئے گفت آشنا: نئے زمانے کے برہن ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۰ء، ص ۲۲۴

۹۔ کشور ناہید، لب گویا، دشت قیس میں لیلیٰ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۱ء، ص ۳۱۔۳۰

۱۰۔ ایضاً، ص ۳۹۔۳۸

۱۱۔ کشور ناہید، گلیاں دھوپ دروازے، دشت قیس میں لیلیٰ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۱ء، ص ۵۸۲۔۵۸۱

۱۲۔ ہیولاک ایلس، عورت جنس اور محبت: عورت جنس کے آئینے میں، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۹ء، ص ۷۷

۱۳۔ کشور ناہید، دشت قیس میں لیلیٰ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۱ء، ص ۱۸۶۔۱۸۵

۱۴۔ باقر مہدی، نسائی بوطیقا، نئے زمانے کی برہن ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۰ء، ص ۵۷

۱۵۔ کشور ناہید، تعبیر، دشت قیس میں لیلیٰ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۱ء، ص ۲۲۴۔۲۲۳

۱۶۔ نسرین انجم بھٹی، چند سوال: ادب کی نسائی رد تشکیل، وعدہ کتاب گھر، کراچی، ۲۰۰۶ء، ص ۱۰۴

۱۷۔ کشور ناہید، روایت نہ ٹوٹے، دشت قیس میں لیلیٰ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۱ء، ص ۲۱۴ تا ۲۱۶

۱۸۔ باقر مہدی، نسائی بوطیقا، نئے زمانے کی برہن، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۰ء، ص ۶۲

۱۹۔ فہمیدہ ریاض، رد تشکیل۔ آخر کیوں؟، ادب کی نسائی رد تشکیل، وعدہ کتاب گھر، کراچی، ۲۰۰۶ء، ص ۱۳۔۱۲

۲۰۔ کشور ناہید، میں کون ہوں: دشت قیس میں لیلیٰ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۱ء، ص ۵۷۶ تا ۵۷۸

۲۱۔ کشور ناہید، اسیں بریاں دے لوکو، دشت قیس میں لیلیٰ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۱ء، ص ۶۸۹۔۶۸۸

۲۲۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، منہ بند سبز الائچی، کشور ناہید، پاکستانی شاعرات۔ تخلیقی خدوخال، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۸ء، ص ۱۶۶

۲۳۔ ایضاً، ص ۱۶۷

۲۴۔ کشور ناہید، گلاس لینڈ سکیپ، دشت قیس میں لیلیٰ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۱ء، ص ۷۰۹ تا ۷۱۱

۲۵۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، منہ بند سبز الائچی، کشور ناہید، پاکستانی شاعرات۔ تخلیقی خدوخال، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۸ء، ص ۱۷۶

۲۶۔ کشور ناہید، تم سے، دشت قیس میں لیلیٰ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۱ء، ص ۵۳۷۔۵۳۸

۲۷۔ کشور ناہید، ترالٹیا شہر بھنبھور، دشت قیس میں لیلیٰ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۱ء، ص ۴۷۶۔۴۷۵

۲۸۔ آصف فرخی، بانوئے گفت آشنا، نئے زمانے کی برین، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۰ء، ص ۲۶۲

۲۹۔ کشور ناہید، رات آتی ہے، دشت قیس میں لیلیٰ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۱ء، ص ۵۴۲۔۵۴۱

۳۰۔ کشور ناہید، Face the Pan، دشت قیس میں لیلیٰ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۱ء، ص ۴۹۴۔۴۹۳

۳۱۔ کشور ناہید، -=+x-، دشت قیس میں لیلیٰ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۱ء، ص ۴۸۸۔۴۸۷

۳۲۔ کشور ناہید، کشور ناہید، دشت قیس میں لیلیٰ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۱ء، ص ۴۶۷۔۴۶۵

۳۳۔ کشور ناہید، بری عورت کی کتھا، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۱ء، ص ۹۶

۳۴۔ کشور ناہید، موم محل، دشت قیس میں لیلیٰ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۱ء، ص ۹۵۱۔۹۵۰

۳۵۔ انور مسعود، فارسی ادب کے چند گوشے، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۲۰۰۰ء، ص ۱۷

۳۶۔ انور مسعود، فارسی ادب کے چند گوشے، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۲۰۰۰ء، ص ۱۸

۳۷۔ بیدار بخت، نقش پنہاں، ایران کی باغی شاعرہ، فروغ فرخ زاد کا کلام، ایجوکیشنل پبلی کیشن ہاؤس، دہلی، ۲۰۱۷ء، ص ۲۷۔۲۶

۳۸۔ فہمیدہ ریاض، پتھر کا صبر، کھلے دریچے سے، وعدہ کتاب گھر، کراچی، ۱۹۹۸ء، ص ۴۲ تا ۴۵

۳۹۔ مینا اسدی، بہروز جلالی، جادوی جادوانگی، مروارید پریس، ۱۳۹۴ء، ص ۲۵۹

۴۰۔ ایضاً، ص ۲۹۷

۴۱۔ پرتو روہیلہ، خدا کے روبرو، فروغ فرخ زاد کی نظمیں، زرنگار بک فاؤنڈیشن، ۲۰۱۶ء، ص ۷۱۔۶۷

۴۲۔ انور مسعود، فارسی ادب کے چند گوشے، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۲۰۰۰ء، ص ۱۸

۴۳۔ ایضاً، ص ۱۹

۴۴۔ بیدار بخت، واپسی، ایران کی باغی شاعرہ، فروغ فرخ زاد کا کلام، ایجوکیشنل پبلی کیشنز ہاؤس، دہلی، ۲۰۱۷ء، ص ۲۸۔۲۹

۴۵۔ ایضاً، ص ۱۰۸ تا ۱۱۰

۴۶۔ بیدار بخت، وصل، ایران کی باغی شاعرہ، فروغ فرخ زاد کا کلام، ایجوکیشنل پبلی کیشنز، ہاؤس، دہلی، ۲۰۱۷ء، ص ۹۲۔۹۱۔۹۰

۴۷۔ ڈاکٹر رضا براہنی، تاریخ، مذکر ایران، نگاہ پریس، ۱۲۱۴، ص ۲۱۳

۴۸۔ انجم طاہرہ، ڈاکٹر، فروغ فرخ زاد: زندگی نامہ ادبی ہمراہ نامہ ہای چاپ نشدہ، الحمد، شمارہ نمبر ۷، جون ۲۰۱۷ء، الحمد اسلامک یونیورسٹی، اسلام آباد، ص ۱۲۵

۴۹۔ فہمیدہ ریاض، سپیدہ عشق، کھلے دریچے سے، وعدہ کتاب گھر، کراچی، ۱۹۹۸ء، ص ۷۷

۵۰۔ فہمیدہ ریاض، گزراں، کھلے دریچے سے، وعدہ کتاب گھر، کراچی، ۱۹۹۸ء، ص ۸۵

۵۱۔ انجم طاہرہ، ڈاکٹر، فروغ فرخ زاد: زندگی نامہ ادبی ہمراہ نامہ ہای چاپ نشدہ، الحمد، شمارہ نمبر ۷، جون ۲۰۱۷ء، الحمد اسلامک یونیورسٹی، اسلام آباد، ص ۱۳۰

باب چہارم

فروغ فرخ زاد اور کشور ناہید کی شاعری: تقابلی جائزہ

پہلے باب کے آغاز میں تقابلی مطالعوں کی روایت، ضرورت، اہمیت اور طریقہ کار کو تفصیل سے واضح کر دیا گیا ہے۔ اس باب میں ان تمام چیزوں کو سامنے رکھتے ہوئے کشور ناہید اور فروغ فرخ زاد کے نسائی تصور کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان کی شاعری میں موجود اشتراکات اور افتراقات کو ڈھونڈنے کی سعی کی گئی ہے اور ساتھ ہی ان کے موضوعات اور پیشکش کا جائزہ بھی گیا ہے۔

عالمی منظر نامے پر ترقی پسند تحریک کے خدوخال اس وقت نمایاں ہوئے جب تیسری دنیا کے محنت کش طبقات معاشی وسیاسی بحران کا شکار تھے۔ برصغیر میں ۱۹۲۰ء کے بعد کا زمانہ سامراج کے ہاتھوں میں پسی ہوئی چھوٹی چھوٹی قومیتوں کے اشتراک کا زمانہ تھا۔ وہ لوگ جو رات کی تاریکی میں اپنی پلکوں میں خوابوں کے بنتے بگڑتے نقوش کا افسانہ اپنے آپ کو سنانے سے گھبراتے تھے اب دن کے اُجالے میں انہی خوابوں کی تعبیر کی عملی صورت دیکھنے کے لئے اپنا سب کچھ داؤ پر لگانے کے لیے تیار تھے۔ خوابوں کی ارزانی کا موسم اپنی آخری سانسیں لے رہا تھا۔ معاشی بوجھ کے تلے دبے کھوکھلے بدن توانا ہو رہے تھے اور بے خواب آنکھوں میں نئے خواب سر سرا رہے تھے۔

۱۹۱۷ء میں روس میں انقلاب کا واقعہ تاریخ کا ایک بہت اہم واقعہ ثابت ہوا۔ اس واقعہ نے پوری دنیا پر اثرات مرتب کئے۔ خاص طور پر تیسری دنیا کے کچھ ممالک جن میں ہندوستان اور ایران بھی شامل تھا۔ ان ممالک میں سیاسی اور معاشی کشمکش کی بنا پر اس وقت کے حساس نوجوان طبقہ میں اشتراکی رجحانات فروغ پانے لگے۔ شاعر اور ادیب لینن اور کارل مارکس کے اثر کو قبول کرنے لگے۔ روسی ادب کا بنیادی فلسفہ یہ تھا کہ مذہب کی حیثیت افیون کی سی ہے۔ مذہب باطل تصور ہے۔ انسان کا سب سے بڑا مسئلہ معاش ہے۔ اس طرح

اس ادب کی رو سے سب سے بڑا مذہب انسانیت ہے۔ اور ادب کا کام مذہب سے متنفر کر کے انسانیت پر اعتقاد پیدا کرنا ہے۔ اس طرح یہ نظریات ترقی پسند تحریک کے آغاز کا سبب بنے۔

دوسری طرف ۱۹۲۳ء میں جرمنی میں ہٹلر کی سرکردگی میں فسطائیت نے سر اُٹھایا جس کی وجہ سے پورے یورپ کو ایک بحران سے گزرنا پڑا۔ ہٹلر نے جرمنی میں تہذیب و تمدن کی اعلیٰ اقدار پر حملہ کیا اور بڑے بڑے شاعروں اور ادیبوں کو گرفتار کیا شعراء اور ادباء میں آئن سٹائن اور ارنسٹ ووکر بھی شامل تھے۔

ہٹلر کے اس اقدام پر جولائی ۱۹۳۵ میں پیرس میں بعض شہرہ آفاق شخصیتوں مثلاً رومان رولان، ٹامس مان اور آندمالرو نے ثقافت کے تحفظ کے لیے تمام دنیا کے ادیبوں کی ایک کانفرنس بلائی۔ اس کانفرنس کا نام تھا

"The world congress of the writers for the defense of culture"

ہندوستان سے سجاد ظہیر اور ملک راج آنند نے اس میں شرکت کی اور کچھ دیگر ادیبوں کے ساتھ مل کر "انجمن ترقی پسند مصنفین" کی بنیاد رکھی۔ اس تحریک کے مقاصد طے کئے گئے جو تیسری دنیا کے تمام حالات کو سامنے رکھتے ہوئے طے کئے گئے۔ اس تحریک کا باقاعدہ منشور مرتب کیا گیا جس کے ذریعے کچھ مقاصد بیان کئے گئے۔

۱۔ فن اور ادب کو رجعت پرستوں کے چنگل سے نجات دلانا اور فنون لطیفہ کو عوام کے قریب لانا۔

۲۔ ادب میں بھوک افلاس، غربت، سماجی پستی اور سیاسی غلامی سے بحث کرنا۔

۳۔ واقعیت اور حقیقت نگاری پر زور دینا۔ بے مقصد، روحانیت اور بے روح تصوف پسندی سے پرہیز کرنا۔

۴۔ ایسی ادبی تنقید کو رواج دینا جو ترقی پسند اور سائنٹفک رجحانات کو فروغ دے۔

۵۔ ماضی کی اقدار اور روایات کا از سرِ نو جائزہ لے کر صرف ان روایات اور اقدار کو اپنانا جو صحت مند ہوں اور زندگی کی تعمیر میں کام آسکتی ہوں۔

۶۔ بیمار فرسودہ روایات جو سماج و ادب کی ترقی میں رکاوٹ ہوں اُن کو ترک کر دینا۔

ترقی پسند ادب کی تحریک نے ادب کے کئی ٹیبوز توڑے۔ چنانچہ اس تحریک میں عورت بھی مرد کے ساتھ شانہ بشانہ شاعری کرتی نظر آتی ہے۔

بنیادی طور پر یہ تحریک سماجی ناہمواری کے خلاف فرد کی آواز بن کر ابھری اور واشگاف الفاظ میں یہ کہا گیا کہ اب حُسن کا معیار بدلنا ہو گا۔ اس بات سے شاید ہی کسی کو انکار ہو کہ ترقی پسند تحریک کے زیر اثر ترقی پسندوں نے پہلی بار ادب کے لکھنے والوں کو ادب اور ادیب کے فرائض سمجھائے۔ اس سے پہلے عام طور پر ادب کا جو تصور تھا اس میں فراریت کا عنصر نمایاں تھا۔ زندگی تو تھی مگر وہ حقیقی نہیں بلکہ تخیلی تھی اور جوش و ولولہ کے بجائے خواب ناکی تھی۔ ترقی پسندوں نے سابقہ ادب کو رجعت پسند قرار دیتے ہوئے ادب کا رشتہ عوام سے جوڑ دیا۔ ادب میں اجتماعی زندگی کی ترجمانی پر زور دیا اور ادیب کی انفرادیت پر قدغن لگائی، اشتراکت کی اہمیت کو واضح کیا، ادیبوں کی سیاسی وابستگی کو مستحسن قرار دیا اور عوامی ادب کو فروغ دینے کی کوشش کی۔

اس تحریک سے قبل عموماً انفرادی جذبے و احساس کی ترجمانی کا چلن تھا۔ شاعروں اور ادیبوں کے نزدیک سیاسی و سماجی سطح پر رونما ہونے والے واقعات کوئی اہمیت نہیں رکھتے تھے۔ انہیں اپنا ہی دُکھ کھائے جا رہا تھا جو عموماً حسن و عشق کے مسائل سے متعلق تھا۔

مجنوں گھورکھ پوری کا کہنا ہے:

> ادیب کوئی راہب یا جوگی نہیں ہوتا اور ادب کوئی ترک یا تپسیا کی پیداوار نہیں ہے۔ ادیب بھی اسی طرح ایک مخصوص ہیت اجتماعی، ایک خاص تمدن کا پروردہ ہوتا ہے جس طرح کہ کوئی دوسرا ادب بھی براہ راست ہماری معاشی اور سماجی زندگی سے اسی طرح متاثر ہوتا ہے جس طرح ہماری دوسری حرکات و سکنات۔[1]

اس تحریک کے زیر اثر صرف مردوں نے ہی نہیں بلکہ خواتین نے بھی قابلِ قدر کام کیا ہے۔ اور عورت مرد کی تخصیص سے بالاتر ہو کر صرف فرد کی بات کی۔ ان کے مطابق فرد پہلے انسان ہے اس کے بعد کوئی صنف ہے۔ اس میں ایک کلیہ یہ بھی پنہاں ہے کہ انسانی زندگی اور نسائیت کا گہرا تعلق ہے۔ انسانیت اور نسائیت لازم وملزوم ہیں۔

اس تحریک کے اثرات صرف ہندوستان پر ہی نہیں بلکہ تمام دنیا پر کسی نہ کسی حد تک دکھائی دیتے ہیں۔ شاعر ہو یا ادیب زندگی کا ترجمان اور روح عصر کی آواز ہوتا ہے۔ وہ معاشرے کا ایک فرد ہے اور اس کے دوسرے افراد کی طرح وہ ماحول اور گردوپیش سے اثرات قبول کرتا ہے۔ انیسویں صدی ایران کی تاریخ میں سیاسی مصائب کا ایک دلخراش باب ہے اس زمانے میں ایک طرف برطانوی اور روسی شہنشائیت کے جارحانہ عزائم اور دوسری طرف ملک میں قاجاری بادشاہوں کا ظلم و استبداد اور ملک کے مسائل میں اضافہ کرتے رہے۔ معاہدہ گلستان ۱۸۱۳ء اور معاہدہ ترکمن چای (۱۸۲۸) کے تحت شمال مشرقی علاقوں مثلاً شروان، ایروان اور نجوان وغیرہ پر روس کا قبضہ ہو گیا۔ اکثر مقامی صنعتوں اور دست کاریوں کا خاتمہ ہوا اور ملک مغربی مصنوعات کی منڈی بنا۔ مغرب کے تجارتی اداروں نے مراعات کے ذریعے ایران کی رہی سہی قوت وخوش حالی پر ڈاکہ ڈالنے کی کوشش کی۔ ملک کے اندر ایک ایسا ظالم شخصی نظام حکومت کارفرما تھا کہ ایک عرصے تک جس کے خلاف آواز اُٹھانے کی کسی کو جراءت نہیں ہوئی۔ مگر بالآخر مغربی ممالک ہی بالواسطہ ملک کے اندر نئی ذہنی اور سیاسی تحریک کا سبب بنے۔ مغربی ملکوں سے نئے سیاسی وثقافتی روابط قائم ہونے لگے بیسویں صدی کے آغاز میں آئینی حکومت اور پارلیمنٹ کے قیام کے مطالبے نے زور پکڑا۔ برطانوی اور روسی استعمار کی باہمی کشمکش کے پس منظر میں ان انقلابی مطالبات کو اور ہوا ملی۔

مغرب سے ذہنی اور ثقافتی طور پر قریب آجانے سے ایران میں ایک نئی فکری اور سیاسی تحریک کا آغاز ہوا جس کا نتیجہ بالآخر ۱۹۰۶ء کے انقلاب مشروطیت کی صورت میں برآمد ہوا اور اس تحریک نے اتنی

قوت حاصل کر لی کہ شاہ کو قومی مطالبات کے سامنے جھکنا پڑا اور عوام اپنے ملک میں پارلیمنٹ اور آئینی حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

انقلاب مشروطیت (آئینی حکومت) کو کامیاب بنانے میں شاعر، ادیب اور اخبار نویس پیش پیش تھے ۔ یہ لوگ مغرب کی جمہوری قدروں سے بہت متاثر تھے اور آئینی حکومت کے ذریعے مکمل قومی آزادی اور اقتصادی اور معاشرتی اصلاح چاہتے تھے انہیں معاشرے میں اپنے کردار کی اہمیت کا احساس تھا اور نئے سماجی تصور نے ان کے ذہنی افق کو بہت روشن کر دیا تھا۔ اب وہ ایک خیالی دنیا میں رہنے کی بجائے زندگی کے تلخ حقائق کا سامنا کرنے کے لیے بے تاب تھے انقلاب مشروطیت کے دوران میں شاعروں کے ہاں جو شعور پیدا ہوا وہ مستقل نوعیت کا تھا اور شاعر برابر ملک کے اہم سیاسی واقعات پر اپنے ذاتی تاثرات کا اظہار کرتا رہا لیکن اس انقلاب نے ایران کی سیاسی زندگی کا رخ تو بدلا لیکن اس کی اجتماعی اور اقتصادی زندگی میں کوئی بنیادی تبدیلی نہیں آئی۔

ڈاکٹر محمد ریاض اس دور پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> رضا شاہ پہلوی کو دوسری جنگِ عظیم کے دوران ملک چھوڑنا پڑا اور آپ غریب الوطنی کے عالم میں جوہانسبرگ (افریقہ) انتقال کر گئے۔ انہوں نے ایران کی غیر جانب داری کا اعلان کیا تھا مگر روس اور برطانیہ کی فوجیں ایران میں گھس آئیں اور اتحادی راہِ جنگ اور تیل کی سپلائی کا مطالبہ کرنے لگے۔ ان حالات میں رضا شاہ مستعفی ہو گئے۔ ستمبر ۱۹۴۱ میں ایران کے نظام کو محمد رضا شاہ پہلوی نے سنبھالا اور اب تک اس ملک کی کایا پلٹی جا چکی ہے۔[۲]

۱۹۴۵ء میں تہران میں پہلی مرتبہ ایرانی ادیبوں اور شاعروں کی کانفرنس "کنگرہ نویسنگان ایران" کے نام سے منعقد ہوئی اور ادب کے مختلف شعبوں اور پہلوؤں پر اظہار کیا گیا۔ اس دور کے واضح رجحان میں عورت کو سوسائٹی میں اس کا صحیح مقام دلوانے کی کوشش بھی شامل ہے۔ عورت کی تعلیم اور معاشرے میں اس کی جائز اہمیت کا احساس مغرب کی ہی دین ہے۔ اس زمانے میں حکومت نے پردہ ختم کر کے عورت کو

اجتماعی زندگی میں مرد کے دوش بدوش چلنے کا موقع دیا تھا۔ اسی دور میں پروین اعتصامی جیسی شاعرہ نے معاشرتی مسائل مثلاء تعلیم کی اہمیت، اخلاقی اصلاح، تعلیم نسواں پردہ اور اسی قسم کے دوسرے مسائل پر اظہار خیال کیا۔ یہی تمام وہ عوامل تھے جنہوں نے فروغ فرخ زاد جیسی شاعرہ کو جنم دیا۔ فروغ ایک ایسے دور میں پیدا ہوئی جب عورت حرم سراؤں کی زینت ہوا کرتی تھی اور پردہ نشین تھی۔ جہاں ہنر سے تعلق تو دور کی بات عورت کا نام بھی عیب سمجھا جاتا تھا۔ ایک ایسا معاشرہ جہاں عورت پستی کی علامت سمجھی جاتی تھی جبکہ مرد "شمشیر" اور طاقت کے استعاروں میں بیان ہوتے تھے۔ فروغ نے ایسی فرسودہ روایات کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور شعر و بیاں کا سہارا لے کر مردم سالاری پر مبنی معاشرے کی بنیاد کو جھنجوڑ دیا۔ اپنے دردناک تجربات اور زندگی کے تلخ حقائق کی روشنی میں انہوں نے یہ پالیا کہ عورت کی پستی کی ذمہ دار عورت کی اپنی خاموشی ہے۔ اس لیے اس نے خاموشی توڑ کر عورت کی بستہ زبان کو بولنے کی سکت دی اور اپنے حق کے لیے آواز بلند کرنے کا حوصلہ بخشا۔

پروفیسر ڈاکٹر عبدالشکور کا کہنا ہے:

> فارسی شاعری پر مغربی ادب کے اثرات یوں تو بیسویں صدی کے آغاز سے ہی نظر آتے ہیں اور فارسی شاعری میں ایک نیا شعور و احساس بھی انہی اثرات کا مرہونِ منت ہے مگر کلاسیکی روایت کو توڑنے کے لیے کسی ایسے غیر معمولی واقعہ کی ضرورت تھی جو قوت و شدت میں ایران پر عربوں کے حملے کی مشابہت رکھتا ہو۔ یہ عظیم قوت مغربی تہذیب کی روشنی نے بہم پہنچائی۔ اس قول میں مبالغہ آرائی ضرور ہے لیکن اس میں بڑی حد تک صداقت بھی ہے۔ کیونکہ جدید فارسی شاعری کی راہیں مغربی اثرات نے متعین کی ہیں۔[۳]

عالمی تناظر میں اگر ان تحریکوں کے اثرات کا جائزہ لیا جائے تو یہ واضح ہو جائے گا کہ آئندہ زمانوں میں عورت کو بولنے کا اور اپنی بات کو اپنے انداز میں کرنے کا حوصلہ انہی تحریکوں کی بدولت حاصل ہوا۔

ہندوستان میں انگارے کی رشید جہاں نے سب سے پہلے واضح طور پر ایک فرد کے لحاظ سے اپنی آواز اٹھائی معاشرے کے استحصالی طبقے کی بات کی خواہ وہ کوئی مرد ہو یا عورت۔ اپنی حقیقت نگاری سے عورت کی حالت زار کو رقم کیا اور اس کی پسماندگی کے اسباب کا تجزیہ کرتے ہوئے اس کے جنسی اور اقتصادی استحصال پر کڑی نقطہ چینی کی یہی رشید جہاں، عصمت چغتائی جیسی بڑی ادیبہ کی آئیڈیل بنیں اور انہی کے نصب العین کو آگے بڑھاتے ہوئے عصمت چغتائی اپنی اس آئیڈئل شخصیت سے بھی آگے نکل گئیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ عصمت چغتائی کے بعد خواتین کی بڑی تعداد نے ادب میں اپنے رویے کا اظہار کیا۔ نثر میں قراۃالعین حیدر، الطاف فاطمہ، ممتاز شریں، خدیجہ مستور، ہاجرہ مسرور، خالدہ حسین اور شاعری میں کشور ناہید، فہمیدہ ریاض، عذرا عباس، فاطمہ حسن، سارہ شگفتہ ان میں سے چند نام ہیں کشور ناہید یا فروغ فرخ زاد دونوں شاعرات کی شاعری کا جب گہری نگاہ سے جائزہ لیا جاتا ہے تو یہ واضح اشتراک دکھائی دیتا ہے کہ دونوں کے ہاں مساوات اور غیر طبقاتی نظام کی آواز نے ان کے اظہار میں اپنی جڑیں استوار کیں۔

ڈاکٹر عابد سیال کا کشور ناہید کے بارے میں کہنا ہے:

> شاعرات میں کشور ناہید کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ انہوں نے اول و آخر اپنے آپ کو تانیثیت پسند شاعرہ اور ادیب کے طور پر منوایا ہے۔ ان کی تمام فنی، فکری شعری اور نثری جدوجہد میں بطور ایک مصنفہ اپنا انداز بیان اپنانے اور اس کو دوسروں سے واضح کرنے کا رجحان نظر آتا ہے۔ ان کی نظموں میں وہ بطورِ خاص اپنی اس نظریاتی وابستگی کو چھپانے کی کوشش نہیں کرتی ہیں۔ کشور کی نظموں میں فنی لوازم کا لحاظ رکھنے کے باوجود آواز بلند رہتی ہے اور وہ نہ صرف اپنی بلکہ تمام عورتوں کی آواز بن جاتی ہیں۔[۴]

فروغ کہتی ہے:

۱۔ کوئی آرہا ہے

کوئی آرہا ہے

اور دستر خوان بچھا رہا ہے

اور روٹی کو تقسیم کر رہا ہے

اور پیپسی کو تقسیم کر رہا ہے

اور باغِ ملی کو تقسیم کر رہا ہے

اور کالی کھانسی کے شربت کو تقسیم کر رہا ہے

اور ناموں کے اندراج کو تقسیم کر رہا ہے

اور اسپتال کے بستروں کے نمبروں کو تقسیم کر رہا ہے

اور ربڑ کے بوٹوں کو تقسیم کر رہا ہے

اور فردین کی فلموں کو تقسیم کر رہا ہے

اور سید جواد کے بیٹی کے درختوں کو تقسیم کر رہا ہے

اور جو کچھ نہ بک سکا اُسے تقسیم کر رہا ہے

اور ہمیں بھی ہمار حصہ دے رہا ہے۔[۵]

یہ سماجی انصاف اور مساوات کے لیے لکھی ہوئی بہترین نظموں میں سے ایک ہے۔ جس سے واضح ہے کہ فروغ ایک جدید ذہن رکھتی ہے اور اپنے گرد و پیش کے حالات پہ اس کی گہری نظر ہے۔ فروغ کا مذہب انسانیت ہے اور ان کا مخاطب ساری دنیا کے لوگ ہیں۔ محبت بھرا دل، انسانیت پرست انسان اور فطرت کی حسن کاریوں کا شیدائی، موجودہ دور میں غیر امن پسندانہ رجحانات پر حیران اور فکر مند ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر وفا یزداں منش، فروغ کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتی ہیں:

بیسویں صدی میں ابھی ایرانی خواتین کو ان کے حقوق نہیں ملے اور وہ ابھی اپنی روایت کے سلاسل میں گرفتار ہیں، جب آزاد مزاج عورت ان میں سے اٹھ کر

صدیوں سے دبی ہوئی آوازوں کو شاعری میں پکارتی ہے ۔ فروغ فرخ زاد کو یہ محسوس ہوا تھا کہ اس کی ہم وطن خواتین دنیا کی جدیدیت سے پیچھے رہتے ہوئے پس ماندہ ہوتی جارہی ہیں۔ اس کی خواہش تھی کہ ایرانی خواتین کو آزادی اور مردوں کے برابر حقوق ملیں۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ اپنے ہنر کا نصف حصہ خواتین کے درد و غم کی تجسیم کے لیے صرف کر دے گی۔ مگر جب اس کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ دوسرا نصف بھی ایسی عورت کی آواز ہے جو سب عورتوں کے دل میں چھپا ہوا اظہار ہے۔[۶]

کشور ناہید کا کہنا ہے :

تقریر نمبر ۲۷

میری آواز، میرے شہر کی آواز ہے

میری آواز میری نسل کی آواز ہے

میری آواز کی بازگشت نسل در نسل چلے گی

کیا سمجھ کر تم میری آواز کو شور کا نام دے رہے ہو

کِس برتے پر تم میرے اندازِ تخاطب کو مجنونانہ کہہ رہے ہو

کس زعم پر تم بڑھتے ہوئے طوفانوں کو نظر کا دھوکہ

سمجھ رہے ہو

میں پیمبر نہیں ہوں

میں تو بس آج کو آنکھیں کھول کر دیکھ رہی ہوں

تمہاری وحشیانہ رعونتوں کی بو

پیسے کی ہوس کی شکل میں پھیل رہی ہے

تم لیموزین کی پچھلی سیٹ پر نیم دراز ہو

تا کہ شیشوں سے جھانکتی غربت کی سخت دھوپ

تمہارے سرجری شدہ چہرے کو مسخ نہ کر دے

تمہیں تقریروں کے نمبر ازبر ہو گئے ہیں

تقریر نمبر ۱۰ غریبوں کو جگانے کی آواز ہے

تقریر نمبر ۱۵، عورتوں میں شعور بیدار کرنے کی آواز ہے

تقریر نمبر ۲۷، ادیبوں، دانشوروں کو مشورے دینے

کی آواز ہے

موسم کا حال پڑھ کر موسم کے بارے میں تقریر کرنے والے

گلی میں بہتی نالیوں کو دیکھنے کب آئیں گے

شجر کاری کے دِنوں میں انقلاب کا پودا لگا دینے سے

انقلاب کا جنگل اُگا نہیں کرتا ہے

لال رنگ دو آنے میں ڈھیر سارا آجاتا ہے

مگر یوں دو آنے کے رنگ میں رنگے دوپٹے

خون کا عکس نہیں بن سکتے

مجھ اگر یہ سب کُچھ معلوم ہے

تو تمہیں کیوں معلوم نہیں

میں سچ کہتی ہوں

میں پیمبر نہیں ہوں

میں تو بس آج کو آنکھیں کھول کر دیکھ رہی ہوں[۷]

فروغ کی شاعری میں اجتماعی مسائل تنقید کے انداز میں بیان کئے جاتے ہیں۔ اس نے زندگی میں غربت کو محسوس کیا تھا اسی وجہ سے وہ ہمیشہ طبقاتی تضاد کی مذمت کرتی ہے۔ اس کو امیر لوگ اچھے نہیں لگتے ہیں۔ وہ عام اور محنتی لوگوں اور خاص طور پر مظلوم لوگوں کو پسند کرتی ہے۔ فروغ کی انسان دوستی کے حوالے سے فروغ کی بہن پوران فرخ زاد نے فروغ کی وفات کے بعد ایک انٹرویو دیتے ہوئے بتایا۔

> بچپن کے زمانے میں ہمارے گھر میں ایک ملازمہ رہتی تھی بڑھیا کی شباہت اتنی ہیبت ناک تھی کہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے ہمیں ڈر لگتا تھا۔ لمبا چوڑا سا چہرہ، بکھرے ہوئے بال اور پیشانی پر بل اس کی ہیبت میں مزید اضافہ کرتے۔ مجھے یاد ہے کہ میرے بھائی کے آئے ہوے دوست اس کی طرف دیکھتے اور اس کا مذاق اڑاتے۔ اس بڑھیا کو سگریٹ کی لت تھی۔ اگر کبھی سگریٹ میسر نہ ہوتی تو بچوں کی طرح رونے اور فریاد کرنے لگتی۔ اس زمانے میں میرے اور فروغ کا جیب خرچ صرف ایک سکہ تھا۔ فروغ اپنا وہ سکہ بڑھیا کو دے دیتی اور کہتی کہ اگر بے چاری کو سگریٹ نہ ملی تو یہ مر جائے گی۔ یہ بڑھیا ہمارے گھر کام کرتے کرتے بیمار پڑ گئی۔ بیماری جب شدید ہو گئی تو اسے ہسپتال لے جایا گیا۔ وہ اپنی آخری سانسیں لے رہی تھی مجھے اتنی ہمت نہیں تھی کہ اس کو ایسی حالت میں دیکھتی لیکن فروغ کا دل آسمان جتنا بڑا تھا۔ وہ گھنٹوں اس کے پاس بیٹھتی اور باتیں کرتی۔ فروغ واحد ہستی تھی جس نے ہمارے گھرانے سے اس کی تجہیز و تکفین میں شرکت کی اور دیر تک اس کی قبر پر آنسو بہاتی رہی۔[۸]

کشور ناہید نے ہمیشہ کھل کر سرمایہ دارانہ نظام کی مذمت کی وہ نظام جو انسان کو اشرف المخلوقات کے درجے سے گر کر سسک سسک کر زندگی گزارنے پر مجبور کرتا ہے جہاں پر ہر کوئی اپنی تکلیفوں کا ذمہ دار دوسروں کو ٹھہراتا ہے اور خود کوئی ذمہ داری لینے پر راضی نہیں ہوتا وہاں خود احتسابی کی ضرورت پڑتی ہے۔

خود احتسابی

جب آخری مرغ کی آخری آواز آئے گی

جب ستارہ سحری، آخری رات کے سفر

کے اختتام کا اعلان کرے گا

اور آخری دن کا سورج

خون تھوکتی صبح کا پیغام لے کر آئے گا

میں اپنا سر تکیے سے اُٹھا کر

اپنی آخری سانسوں کا حساب کروں گی

جب آخری سیاست دان، آخری آدمی کو بھی

قتل کر دے گا

جب آخری بچہ بھی چاول کے ایک دانے کی

تلاش میں بلک بلک کر مر جائے گا

جب آخری قطرہ خون بھی

مادرِ وطن کے تحفظ میں صرف ہو جائے گا

جب دعا کا آخری حرف بھی ختم ہو جائے گا

جب آخری گولی بھی سینے کے پار اُتر جائے گی

میں اپنا سر تکیے سے اُٹھا کر

اپنی آخری سانسوں کا حساب کروں گی

جب یتیم بچہ بھی اپنی ماں کا نام لے کر

فرماں رواؤں کو کوسے گا

جب انسان، آخری قدم، آخری چاند

پر رکھے گا

میں اپنا سر تکیے سے اُٹھا کر

اپنی آخری سانسوں کا حساب کروں گی۔[۹]

فروغ فرخ زاد اور کشور ناہید کے ہاں موضوعات کے انتخاب میں واضح اشتراک دکھائی دیتا ہے۔ فروغ ایک ایسی دنیا کی باسی ہے جہاں پر فکر میں آوازوں میں اور الفاظ میں ہر جگہ ناانصافیاں پائی جاتی ہیں۔ ابتدائی عورت نے پوری تاریخ میں جن ناموزوں تجربات کی تلخی جھیلی ہے۔ اس کا احساس فروغ کی شاعری میں جابجا ملتا ہے فروغ کے ہاں ایک ایسی عورت کا سراغ ملتا ہے۔ جس کی ابتدا ایک انتہائی خوب صورت اور پری پیکر ہستی سے ہوئی لیکن معاشرتی ناہمواریاں اس خوبصورت ترین ہستی کی پیشانی پر بل لے آتی ہیں اور وہ بد نما نظر آنے لگتی ہے۔ فروغ کے مطابق ایرانی عورت صدیوں سے ظلم کی چکی میں پستی چلی آئی ہے لیکن اس نے کبھی آواز نہیں نکالی وہ ایک ایسی عورت رہی ہے جو کہ آمرانہ حکومت، مشرق و مغرب کی چپقلش اور مرد کے حاکمانہ رویے کا شکار رہی اور فروغ نے ہمیشہ ایسی ناانصافیوں کے خلاف آواز اٹھائی ہے۔ فروغ نے ہمیشہ ان موضوعات کا انتخاب کیا جو اس کے دل کے قریب تھے اور جو ایک جدید ذہن رکھنے والی سوچنے سمجھنے اور شعور رکھنے والی عورت کے محسوسات ہو سکتے تھے۔

انور مسعود کا کہنا ہے

> فروغ کی شاعری میں زندگی دھڑکتی ہوئی دکھائی دیتی ہے انسانی جذبات کی بے ساختہ عکاسی اس کا طرہ امتیاز ہے۔ انسان پر جو بھوت سوار ہو جاتے ہیں اور اسے ابنارمل بنا کر رکھ دیتے ہیں ان کی شاعرانہ تصویر کشی اس دور کے ایرانی شعراء میں فروغ سے

بڑھ کر شاید ہی کسی نے کی ہو۔ اس کی شاعری عشق ہوس، انتقام آرزو، کرب فرار،
دیوانگی اور تجسس کے مختلف النوع نے shades کا مرقع ہے۔[10]

فروغ سے پہلے فارسی اشعار میں کسی نے بھی عورتوں کے حقیقی احساسات کے بارے میں لب کشائی کرنے کی جرأت نہیں کی ہے۔ فروغ کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ انہوں نے تاریخ میں پہلی بار نسوانی حدود کو پار کیے بغیر شاعری کے میدان میں قدم رکھا اس سے پہلے خواتین اپنے حقیقی احساسات اور خدشات خواتین شعرا کے آثار میں دریافت نہیں کر سکتی تھیں۔ فروغ نے واشگاف انداز میں اپنے محسوسات کا اظہار کیا اور اپنی زبان سے وہ باتیں بھی ادا کر دیں جن کے بارے میں مرد اظہار کرتے ہوئے جھجکتے تھے۔

ڈاکٹر وفا یزداں منش کہتی ہیں:

فروغ اپنے پہلے شعری مجموعے میں تہذیبی، اجتماعی بندشوں اور شدت پسند روایتوں کے باعث افسردگی کا شکار اور جوانی کے ہیجان و گرمجوشی سے بھرپور ہے۔ یہیں سے اس کی شاعری کا موضوع عشق اور جنسی پہلو چلتا اور آگے بھی چلتا جا رہا ہے۔ اس کے بعد اس پر احتجاج اور مخالفت شروع ہوتی ہے مگر فروغ کی جسارت اور ارادہ کہاں بجھنے والا تھا وہ ایک نڈر عورت تھی جو پہلے سے زیادہ اپنی فریاد میں شدت لائی۔[11]

سبز وہم

میں تمام دن آئینے کے اندر روتی رہی
بہار نے میرے دریچے کو
درختوں کے سبز وہم کے ہاتھوں سونپ دیا تھا
میرا بدن میری تنہائی کے خول کے اندر نہیں سما سکتا تھا
اور میرے کاغذی تاج کی بُو نے
اس دھوپ سے محروم سرزمین کی فضا کو آلودہ کر دیا تھا

میں بے بس تھی، اب میں بے بس تھی

گلی کی آوازیں پرندوں کی چہکار

اُون کی گیندوں کے گم ہو جانے کا شور و غل

اور بچوں کی بھاگتی ہوئی چیخ پکار

اور غباروں کا ناچ

غبارے جو صابن کے جھاگ سے بنے ہوئے بلبلوں کے مانند

دھاگے کی کونپلوں کے آخری سرے سے اُوپر چڑھ رہے تھے

اور

تمام دن میری نگاہیں

اپنی زندگی کی آنکھوں پر جمی رہی تھیں

ان دو بے قرار ڈری ہوئی آنکھوں پر

جو میری ٹھہری ہوئی نظروں سے

جھوٹوں کے مانند کتراتی

اور پلکوں کے محفوظ کونوں میں پناہ ڈھونڈتی تھیں۔

کیسی چوٹی، کیسی بلندی؟

کیا یہ سبھی پُر پیچ راہیں

جا کر نہیں مل جاتیں؟ ختم نہیں ہو جاتیں؟

میں نے آخر تم سے کیا پایا، اے سادہ دلوں کو فریب دینے والے لفظو

اے بدنوں کی ریاضتو، اور اے دل کی خواہشو

اگر میں اپنے بالوں میں کوئی پھول ٹانک لیتی

تو کیا وہ اُس جعل سے اُس کاغذی تاج سے

جو میرے سر پر پڑا پڑا اسڑ گیا ہے، زیادہ دلفریب نہ ہوتا؟

کیسی چوٹی، کیسی بلندی؟

مجھے پناہ دو، اے دھندلے چراغو!

اے دبدھے میں پڑے ہوئے اُجلے گھرو!

جن کی دھوپ میں چمکتی ہوئی چھتوں پر

دھلے ہوئے کپڑے خوشبودار دھوؤں کی گود میں لہرا رہے ہیں۔

مجھے پناہ دو اے سادہ اور مکمل عورتو!

جن کی نازک انگلیوں کے سرے جِلد کے اوپر سے

اپنے نازائیدہ بچوں کی مست کر دینے والی جنبش کو

ٹٹولتے رہتے ہیں

اور جن کے گریبانوں کے چاک میں ہوا

ہمیشہ تازہ دودھ کی خوشبو سے ملی ہوتی ہے۔

کیسی چوٹی، کیسی بلندی؟

مجھے پناہ دو اے آگ سے بھرے ہوئے چولھو!

کہ تم خوش بختی کے لعل ہو۔

مجھے پناہ دو اے باورچی خانوں کے دھوئیں سے کجلائے ہوئے

تانبے کے برتنو!

اے سلائی کی مشینوں کے دلگیر نغمو!

اور اے قالینوں اور جھاڑوؤں کی دن رات کی لڑائیو!

مجھے پناہ دو اے تمام جوشیلی چاہتو!

میں بے بس تھی

اب میں بے بس تھی

میرے پاؤں کی چاپ راستے کے انکار سے بلند ہو رہی تھی

اور میری لومیدی میری جان کے حوصلے سے کہیں بڑھ گئی تھی

اور وہ بہار، وہ سبز رنگ وہم

جو میرے دریچے کے سامنے سے گزرا کرتا تھا

میرے دل سے کہہ رہا تھا: "دیکھ

تُو ذرہ بھر آگے نہیں بڑھ سکی

بلکہ نیچے ہی نیچے اترتی چلی گئی ہے۔"[۱۲]

موضوعات کے حوالے سے کشور ناہید بھی ایک نئے طرز احساس کی جانب سفر کرتی نظر آتی ہیں جس میں عورت کے اپنے وجود کا بھرپور احساس نمایاں ہے۔ کشور کی عورت بھی دوسروں کے وجود کا سایہ نہیں بلکہ مکمل شخصیت کے طور پر ابھرتی ہے۔

انہوں نے روایتی رویوں سے کنارہ کشی کی اور ایک نئی فضا میں سانس لینے کی کوشش کی۔ مغرب کے ادبی رجحانات کا اثر بھی اُن کی شاعری میں نظر آتا ہے۔ کشور نے ایسے موضوعات پر لکھا جو بہت تلخ تھے خواتین ان پر سوچتی تھیں مگر اظہار نہیں کرتی تھیں۔ خواتین کو کبھی خون خرابے کی جڑ لکھا جاتا رہا ہے کبھی فساد کا کارن لیکن یہ کبھی نہیں دیکھا کہ اس کی اہمیت مال غنیمت سے زیادہ بھی ہو سکتی ہے۔ اس کی بھی سوچ ہے اور ذہن ہے وہ کوئی اثاثہ نہیں جس پر یہ حق ملکیت رکھا جائے وہ سوچنا چاہتی ہے۔ بولنا چاہتی ہے، جینا چاہتی ہے۔

عروسی

میں نے تنہا، سینکڑوں راتیں گُزاریں
جاگ کر یہ سوچتے
کس طرح ہو گی بھلا
اُس وصل کی شب کی سحر
جس شب کہ آنکھوں کی چبھن
نیند کی خوشبو کی بانہوں سے لپٹ کر سو رہے

میں نے بچپن ہی سے پُوجا تھا
دُلہن کا عکس و رنگ
جامنی رخسار کی رنگت

مہک، اُبٹن کا لمس

شعلہ رُو، شعلہ نفس

سِمٹی، سمٹائی سی

گھڑی کی طرح بیٹھی ہوئی

میں نے بچپن سے چاہا تھا

دُلہن بن جاؤں میں!

چمپئی رنگت کو گہرے شعلہ رُو کپڑوں میں ایسے ڈھانپ لُوں

میرا چہرہ، میری سکھیاں ڈھونڈنے بیٹھیں

تو تھک کر ہنس پڑیں

مُجھ کو گٹھڑی کی طرح دیکھیں

تو ڈھولک تھام لیں

میں دُلہن ایسی بنی لیکن

کہ مہندی تھی نہ افشاں

اور نہ اُبٹن کا خمار

آنکھ میں کاجل کی تحریریں بھی

اپنوں سے جُدائی کے غموں میں دُھل گئیں

رہ گئی اس قُرب کی خوشبو کہ جس کے نام پر

خون کے رشتوں کو بھی

میں زندگی سمجھی نہیں

اور پھر خوشبو سے رشتہ تا بکے!

خواب کی مانند جینا تا بکے!۱۳

فروغ کی ابتدائی شاعری میں عشق اور ہوس ہم معنی دکھائی دیتے ہیں لیکن رفتہ رفتہ اس کے یہاں عشق نے زندگی کی پہنائیوں کو اپنے اندر سمیت لیا فنون لطیفہ اس کے محبوب بن گئے وہیں لوگوں کو جس طرح مذہب سے عقیدت ہوتی ہے ایسی ہی عقیدت اسے شاعری سے ہے۔

انور مسعود کا کہنا ہے

> فطرت کا ہر مظہر اسے عزیز ہے صابن کے جھاگ سے بلبلے بناتے ہوئے بچے، دوپہر کی تمازت سے جلتا ہوا شہر، سورج کی گرمی میں تپتی ہوئی گلیاں، خاموش سڑک پہ پاؤں کی چاپ، ہاتھوں میں پتھر لیے ہوئے کنوئں کے پیچھے بھاگتے ہوئے کو دکانِ برہنہ یا کسی جھروکے سے کسی عورت کی مسکراہٹ، ہوا کے زور سے اچانک بند ہوتی ہوئی کھڑکی، گلی سے گزرتا ہوا اور گاتا ہوا کوئی رہرو، چادروں میں لپٹے ہوئے چہرے، گنبدوں پر بیٹھے ہوئے کبوتر، دور سے آتا ہوا کوئی آشنا، یہ سارے منظر اسے بھاتے ہیں۔[۱۴]

کشور ناہید نے اپنی شاعری کا موضوع ایک ایسی اداس اور دل شکستہ عورت کو بنایا ہے جس کا چہرہ اشکوں سے بھیگا ہوا ہے۔ جو مدت تک اپنے دل کے ٹوٹنے پر غم زدہ رہی ہے۔ جس کو زندگی کے میدان میں بار ہا شکست کا سامنا کرنا پڑا ہے لیکن وہ لوٹ پوٹ کر پھر نئے جذبے اور طاقت کے ساتھ کھڑی ہو جاتی ہے اور ہار نہیں مانتی۔

آخری فیصلہ

کانٹوں کی چٹان پہ کھڑی

میں آنکھوں کی سوئیاں نکال رہی ہوں

یہ علاقہ کس سلطنت میں شامل ہے۔

ملوکیت، میرے زبان پہ کانٹے

حلق میں پھندا

آنکھیں باہر

شاہ بلوط کے لمبے درختوں جیسے

لمبے پُوت، بہت ہو گئے ہیں۔

جنگل میں درخت زیادہ ہو جائیں

تو آگ لگا کر درخت کم کر دیے جاتے ہیں

باہر نکلی ہوئی آنکھ سے زعفران کا کھیت

اور کٹے ہوئے بازوؤں سے گنے کی پوریاں بن گئی ہیں۔

ہم نے ایک جھوٹ بولا تھا نہ!

اب ساری عمر اُس کو سچ ثابت کرنے میں گزار دیں گے

ہم کہ جو زندگی بھر

اپنے حصے کی روٹی کمانے کی کوشش کرتے ہیں

اور بھوکے رہتے ہیں

جھوٹی آس کی چھتری تلے

بُلبلے جیسے آنسو

بتاشوں کی طرح تھال میں سجائے

کب تک یہ بتلاتی رہوں گی

کہ وہ تمہارا قاتل نہیں ہے۔

قتل محض ثانیے میں

زندگی کا رشتہ ختم کرنے کا نام نہیں

موجود سے انکار بھی

تو قتل کے مترادف ہوتا ہے

میرا جی کرتا ہے

وہی جو سب میرے قاتل ہیں

مین انہیں ہوا کی طرح نگل جاؤں[۱۵]

جنس ایک ایسا موضوع ہے جو فروغ فرخ زاد کو بہت محبوب ہے اور کشور ناہید کے ہاں بھی ایسی کئی نظمیں موجود ہیں جو روایتی عورت کی شاعری سے ہٹ کر ہیں۔

انور مسعود اس حوالے سے لکھتے ہیں:

> اس میں کوئی شک نہیں کہ ان نظموں سے یہی تاثر ملتا ہے کہ فروغ بدن میں ڈوبی ہوئی ہے۔ اس کے نزدیک عشق اور ہوس میں کوئی امتیاز نہیں۔ اس نے منفی ہیجان کے تلاطم کو اشعار میں انڈیل دیا ہے اور اس کرب کی بڑے تیز رنگوں میں نقاشی کی ہے۔[۱۶]

فروغ دیواروں سے زنجیروں سے وحشت زدہ کھائی دیتی ہے اور قید و بند کے ماحول سے دور بھاگ جانا چاہتی ہے۔ اس دنیا نے اور وفا سے نا آشنا محبوب نے فروغ کے سینے میں ایک طوفان برپا کر رکھا ہے۔

۷۔ آرزو

کاش میں ایک خاموش ندی کے کنارے پر
ایک پر اسرار پودے کی خوشبو ہوتی
کہ جب تو وہاں سے گزرتا
تو تجھ سے لپٹ جاتی

کاش میں ایک چرواہے کی بانسری کی طرح
تیرے دیوانے دل کے نغمے گاتی
اور ہوا کے ہودے پر سوتی ہوئی
تیری ڈیوڑھی کے آگے سے گزر جاتی

کاش میں تیری کھڑکی سے صبح کے وقت
بہار کے سورج کی کرنوں کی طرح
لرزتے ریشمی پردوں سے چھن جاتی
اور تیری آنکھوں کا رنگ دیکھتی

شکستہ دلوں پر غم کا عطر چھڑکتا
میرے سامنے

جوانی کے زمستاں کی تلخ جوانی ہوتی

اور میرے پیچھے

عشق ناگہاں کی تابناک گرمیاں

اور میرا سینہ

دردو اندوہ کی بدگمانی کی ایک منزل ہوتا

کاش میں پت جھڑ کا موسم ہوتی

کاش میں پت جھڑ کا موسم ہوتی"[۱۷]

کشور ناہید کا انداز بہت ملائم، نرم اور خالص زنانہ ہے۔ عورت کی جذباتی کشمکش، جنسی کشش، خوف، اظہار کی خواہش اور ماحول کی جبریت نے بھی حجابات کو اور بھی حسین بنادیا ہے۔

<u>تم سے</u>

اتنی گرمی

میرا تن اندر سے بھٹی

باہر ۱۱۷، ۱۲۰ کی گرمی

مہندی، لمحے بھر کو ٹھنڈک

پیچ، ہتھیلی آن جگائے

پانی پندے پر ڈالو تو

آتی جاتی ٹھنڈک

رُوئیں رُوئیں میں

ٹھہر ٹھہر کے چین سجائے

ٹھنڈے پیٹ اور نرم کٹوروں

بیچ رکھے ہاتھوں میں جاگے

دُھوپ میں جیسے گیلے کپڑے

رات میں جیسے خواب کا نشہ

پھیلے پھیلے اور بھی پھیلے

ان چھوٹی کلیوں کی دودھ سفیدی

جاگتی بند ہوتی آنکھوں کی صورت

پھول میں ڈھلنے کو تڑپے تو

فاختہ جیسے بازو کھولو

انگڑائی کی گرمی تم سے نئی چنبیلی مانگ رہی ہے[۱۸]

فروغ جس حساس اور ذہن رسا رکھنے والی شاعرہ سیاسی موضوعات سے کس طرح کنارہ کش رہ سکتی تھی اس موضوع کی اولین جھنکار اس کی " نظم " اے ارض پر گہر " میں سنائی دیتی ہے اس نظم میں فروغ نے نام نہاد حب الوطنی کے پرزے کرتے ہوئے اس کے پیچھے کار فرما خوشامد پرستی اور مال بنانے کی جہد کو بے نقاب کیا ہے اور ساتھ ہی اصل ایران کا نقشہ پیش کیا ہے۔ جہاں شاعرہ کا پہلا قدم آلودہ فضا اور کیچڑ سے بھری سڑکوں پر پڑتا ہے۔ اس لیے یہ کہنا بے جانہ ہو گا کہ اگر زندگی مہلت دیتی تو فروغ کی شاعری کا تیسرا دور فلسفیانہ اور سیاسی موضوعات سے عبارت ہوتا۔

اے ارضِ پُر گہر

میں جیت گئی

لافانی بنالیا خود کو

ایک شناختی کارڈ میں اپنا نام مزّین کر لیا

اور میری ہستی ایک عدد سے مشخص ہو گئی

پس زندہ باد ۶۷۸ صادرہ ۵ ساکنِ تہران

اس کے سوا سب کچھ بیکار ہے

آغوشِ میزبان مادر وطن

تہذیب و تمدن کی لوریاں

اور جھن جھن قانون کا جھنجھنا

آہ۔۔۔ اس کے سوا سب بیکار ہے

فرطِ شادمانی سے

میں دریچے کے پاس گئی اور بڑے اشتیاق سے

چھ سو اٹھہتر بار ہوا کو

جو گرد و غبار اور کوڑے دان کی بدبو سے منقبض تھی

اپنے سینے کے اندر کھینچا

اور چھ سو اٹھہتر بار قرضے کے تمسکوں پر

اور واپسی کے تقاضوں کے نوٹسوں پر

لکھا۔۔۔ فروغ فرخ زاد

اس سرزمین شعر و گل و بلبل میں

زندگی ایک بخشش ہے

وہ بھی تب

جب تیرا وجود سالہا سال بعد منظور کر لیا جائے

تو میں نے اپنی پہلی قانونی نگاہ سے

پردے کے پیچھے چھ سو اٹھہتر شعرا کو دیکھا

جو بازیگروں کی طرح فقیروں کا بہروپ بھرے

کوڑے دان میں ردیف اور قافیہ ٹٹول رہے تھے

اور میرے پہلے قانونی قدم کی آواز سے

جو کیچڑ میں پڑا تھا

چھ سو اٹھہتر بلبلانِ مرموز

جو مزاقاً چھ سو اٹھہتر کالے کوّوں کے بھیس میں ظاہر ہوئی تھیں

اختتام روز کی جانب سستی سے پرواز کر گئیں

اور میری پہلی قانونی سانس

چھ سو اٹھہتر سرخ پھولوں کی مہک سے بھر گئی

جو کہ عظیم پلاسٹک کے کارخانے نے بنائے تھے

میں نے عوام کے درمیان قدم رکھا

جن کے پاس اگرچہ روٹی نہیں

لیکن ایک بڑا وسیع میدان ہے

جس کی جغرافیائی حدیں

شمال میں ایک پُر طراوت وسبز میدان سے

اور جنوب میں نیستی وہلاکت کے میدان سے

اور بھیڑ سے بھرے

علاقوں میں توپ خانے کے میدان سے ملتی ہیں۔[۱۹]

فروغ کی بیشتر شاعری دردناک احساسات پر مشتمل ہے۔عام انسان کی زندگی کی ہولناکیوں اور المناکیوں نے اس کے ذہن ودل کو بری طرح متاثر کیا تھا۔

ڈاکٹر شریف حسین قاسمی "جدید فارسی شاعری" میں لکھتے ہیں:

فروغ فرخ زاد ایران کی بہترین شاعرہ نہ سہی لیکن وثوق کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ یہ معاصر شعراء میں سب سے زیادہ صمیمی اور پُر خلوص شاعر ہیں۔ان کی تمام تر شاعری عوام کے لیے اور عوام سے ہی متعلق ہے۔ان کے کلام کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ انسان اور انسانیت ایسے دو موضوع ہیں جو مختلف انداز سے ان کے کلام پر حاوی ہیں۔انسان سے ان کی محبت اور انسانیت سے ان کا والہانہ عشق انہیں موجودہ زمانے کی انسانیت سوز روایات پر تنقید کرنے اور انہیں صراحت سے بیان کرنے پر آمادہ کرتے ہیں۔[۲۰]

کشور ناہید نے سیاسی موضوعات پر ہمیشہ کھل کر بات کی ہے حتیٰ کہ مارشل لا کے دور میں جب بڑے بڑوں نے جان کے خوف سے چپ سادھ لی تب بھی کشور کا قلم سچ بولنے سے نہیں رُکا۔ان کا ایمان ہے کہ اگر سب خاموش ہو جائیں گے تو پھر کون بولے گا؟ ہر کوئی اگر مصلحت گوئی کو اپنا ایمان بنالے تو جمود کیسے ٹوٹے گا ؟ تبدیلی کیسے آئے گی۔

اپاہج ماں کی گولڈن جوبلی

میری سنو!

میں تم سے مخاطب ہُوں

میں پاکستان ہوں!

تمہاری ماں مٹی

میں نے ان لوگوں کی اُمیدوں کی

کوکھ سے جنم لیا تھا

جو اب ہم تم میں نہیں ہیں۔

وہ سچے لوگ

جنہوں نے ایک علیحدہ مملکت کا خواب دیکھا تھا

ایک ایسی مملکت کا خواب

کہ جس میں وہ اور ان کی آئندہ آنے والی نسلیں

آزادی اور فخر سے خود کو انسان کہہ سکیں

وہ سچے لوگ جنہوں نے اس خواب کی تعبیر کے لئے

اپنی زندگیوں کا سودا کیا تھا۔

میں ان ہی سچے لوگوں کے

خوابوں کی تعبیر ہُوں

یہ کیسا خوف ہے

جو میری رگوں میں جوش مارتے خون کو شرمساری کی

برف میں دھنسے دے رہا ہے

میں نے تو ہوا کے پروں پر بھی

"لے کے رہیں گے پاکستان" لکھا تھا

میرے زمانے میں تو تتلیوں نے بھی

میرے پرچم کا رنگ پہنا تھا

میرے بچّو!

میرے سچے لوگوں کے بچّو

تم اپنی وراثت کو بُھول کر

کب تک اپنے ضمیر کو جھٹلاتے

اور جھوٹے وعدوں کو پہنتے رہو گے

میرے بچّو!

مجھے تمہارے لفظ نہیں چاہئیں

پھٹی ہُوئی تصویر یا پھٹے ہُوئے نقشے کی

تاریخ رقم کرنا، تمہارا مقدّر نہیں ہے۔

میری بنتی سُنو!

مجھے میرے سفید بالوں کا وقار لوٹا دو

مجھے میری کوکھ میں پلنے والا امن واپس لوٹا دو

اُٹھو میرے بچّو میں تم سے مخاطب ہُوں

ماں! بھلا اور کس سے بات کر سکتی ہے![۲]

ایک اور واضح اشتراک جو کشور ناہید اور فروغ فرخ زاد کی شاعری میں نمایاں نظر آتا ہے وہ یہ ہے کہ دونوں شاعرات کے ہاں صنف سے بڑھ کر فرد کا تصور موجود ہے۔ یہ شاعرات مردانہ بالادستی کو رد کرتی ہیں اور معاشرے میں عورتوں کے ساتھ روا رکھی جانے والی ناانصافی اور ظلم و ستم پر ان کا غم و غصہ صاف نظر آتا ہے۔ کوئی انسان صرف اس لیے برتر نہیں کہلایا جا سکتا کہ اتفاق سے وہ مرد کے روپ میں جنم لے چکا ہے۔

فروغ کے اشعار کو جو امتیازی خصوصیت حاصل ہے اس کو وہ اپنے عورت ہونے کا مرہونِ منت سمجھتی ہیں۔ اس کے اشعار کو جو خوبصورتی ملی ہے وہ دراصل نسوانیت، نسوانی خواہشات اور آرزوؤں کا برملا اظہار ہے۔ نسوانی احساسات اس کے اشعار کا اصل منبع، موضوع مفاہیم اور مفاہیم ہیں۔ ڈاکٹر محسن ہشترودی کا کہنا ہے۔:

> فروغ عورت کو اسیر اور قیدی محسوس کرتی تھی اس بارے میں چاروناچار کہنا پڑتا ہے کہ آزادی نسواں فرانس اور جرمن میں بھی ایک افسانہ ہے کیونکہ عورت ابھی بھی قید میں ہے۔ فروغ اس اسارت کو محسوس کرتی تھی اور وہ اس اسیری کی زنجیر کو توڑنا چاہتی تھی۔ اس کے لیے سچائی کا بیان ضرور تھا۔ ایرانی خواتین شعراء جن میں رابعہ بنت کعب، مہتی اور پروین اعتصامی شامل ہیں، نے فروغ کی طرح سچائی بیان کرنے کی جرات نہیں کی۔ [۲۲]

فروغ اگر مرد کو مخاطب کرتی ہے تو برملا اور واشگاف انداز اپناتی ہے۔ وہ ریاکاری سے کوسوں دور ہے۔ اس کی باتیں سچ پر مبنی ہیں۔ اس نے کبھی اپنی سوچ پر سمجھوتہ نہیں کیا۔

عصیاں

میرے ہونٹوں کو پابند خموشی نہ کرو
کیونکہ میرے دل میں ایک ان کہی کہانی ہے
میرے پاؤں سے یہ سخت بندھن کھول دو
کہ اس مشکل نے مجھے پریشان کر رکھا ہے

اے مردِ انا پرست آ

اور آ کر پنجرے کے دروازے کھول دے

اگرچہ تو نے مجھے ایک عمر قید رکھا

لیکن اب اس لمحے کے لیے مجھے آزاد کر دے

میں وہ طائر ہوں جو عرصے سے

اُڑنے کی آرزو کر رہا ہے

(لیکن) سینے میں گھٹ جانے کے سبب میرا نغمہ ایک نوحہ بن گیا

اور ساری زندگی حسرتوں کی نذر ہو گئی

میرے ہونٹوں پر خموشی کے قفل نہ لگاؤ

کیونکہ میں رازِ دل بیان کرنا چاہتی ہوں

(تاکہ) دنیا کے کانوں تک پہنچا سکوں

اپنی آتشین آواز کی گونج کو

دروازہ کھولو تاکہ میں (بھی)

آسمانِ شعر کی وسعتوں میں اپنے پَر کھول سکوں

(اور) اگر (تم نے) مجھے پرواز کی اجازت دی

تو میں کِھل کر گلستانِ شعر میں ایک پھول بن جاؤں گی

مگر اے مردِ انا پرست

یہ نہ کہہ کہ میرے شعر تیرے لیے باعث شرم ہیں

کیا تجھے یہ معلوم ہے کہ ان آزردہ دلوں کا

اس قفس میں دم گھٹنے لگا ہے

یہ نہ کہہ کہ تیری ساری شاعری (ارتکاب) گناہ تھی

اس شرم وحیا کے (میکدے سے) ایک جام مجھے بھی عنایت ہو

بہشت، حور اور آبِ کوثر تیرے لیے ہیں

(تو) دوزخ ہی میں سہی ایک کٹیا مجھے بھی دے دے

کتاب 'خلوت' شاعری اور خاموشی

میرے لیے یہ ساری چیزیں اسباب نشہ ونشاط ہیں

سو اگر جنت میں میرے لیے جگہ نہیں تو مجھے کیا پروا

کہ میرے دل میں ایک جنت جاودانی موجود ہے

اے مرد! نیک نامی اور عزت کو دور پھینک دے

کہ شرم وحیا نے مجھے اک مستانہ لذت بھی دی ہے

اور مجھے یہ صلاحیت وہ پروردگار دیتا ہے

جس نے شاعر کو دیوانہ دل دیا ہے

آ اور یہ دروازہ کھول دے کہ میں بھی

شاعری کے پر نور آسمان میں پَر کشائی کر سکوں

اگر مجھے پرواز کی اجازت دی گئی

تو (یقیناً) میں گلستان ادب میں میں ایک پھول بن کر کِھل اٹھونگی۔ [۲۳]

فروغ فرخ زاد فارسی شاعری کی عشقیہ شاعری میں ایک نیا لہجہ لے داخل ہوئی ہیں۔ اس نے عشق کی پہنائیوں کو اپنے اندر سمیٹ لیا ہے۔ اس کی تنہائی کا احساس اس کی نفسیات پر نمایاں نظر آتا ہے لیکن وہ نہ خود قنوطیت میں مبتلا ہوتی ہے اور نہ ہی دوسری عورتوں کو کو قنوطیت کا شکار ہونے دیتی ہے۔

منیب الرحمٰن کا کہنا ہے:

> فروغ فرخ زاد کی شاعری فکر کے بجائے براہِ راست حواس کو مخاطب کرتی ہے۔ ان کا عشق خالص ارضی اور جسمانی ہے جو مادیت کو روحانیت پر ترجیح دیتا ہے اور اپنے اظہار کے راستے میں نفسیاتی رکاوٹوں کو روا نہیں رکھتا۔ اس قسم کی شاعری اپنے تاثر کے اعتبار سے دیرپا اقدار کی حامل نہیں کی جا سکتی۔ لیکن اس میں ایک فنکارانہ خلوص ہے جو اسے ابتذال سے بچا لیتا ہے۔ [۲۴]

کشور ناہید کو ہماری ادب کی باغی شاعرہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری میں تاریخ کا وہ مطالعہ پیش کیا ہے جس میں عورت کو ہمیشہ دوسرے درجے کا شہری بنا کر پیش کیا جاتا رہا ہے۔ عورت چکی کے دو پاٹوں میں اس طرح پستی ہے کہ ایک طرف تو اپنے عہد کا جبر اور دوسری طرف معاشرے میں اس مرد کا رویہ جو بظاہر اس کا رفیق اور مہرباں ہوتا ہے لیکن در حقیقت اس کی شخصیت کو فنا کر کے رکھ دیتا ہے۔ کشور ناہید نے معاشرے کے عائد کردہ اخلاقی ضابطوں کے سائے میں مرد کے طرز عمل اور ماں، بہن، بیٹی اور بیوی کے مقدس اور خوبصورت عنوانات کے زیر اثر عورت کی ریزہ ریزہ ہوئی شخصیت کا تجزیہ پیش کیا ہے۔

فہمیدہ ریاض نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے:

مجھے کراچی میں کشور ناہید کے ایک مجموعے کی تقریب اجراء اب تک یاد ہے۔ جس میں میں نے شمولیت کی تھی میں یہ دیکھ کر حیرت زدہ اور مایوس رہ گئی تھی کہ کتاب پر اظہار خیال کرنے والے مرد "اصحابِ نظر" نے کچھ ایسی باتیں کیں تھیں کہ کشور پکوڑے بہت اچھے بناتی ہیں اور کھانا بہت اچھا پکاتی ہیں۔ اردو کے دانش ور طبقوں میں اس وقت تک عورت شاعر ایک اور دلچسپ وقوعہ سمجھا جاتا تھا۔ کوئی عورت بھی اگر ضد کر کے ان کی شریک سفر ہو گئی تو وہ اس سفر کو ذرا رنگین تو ضرور بنا سکتی ہے لیکن اس سے بڑھ کر اہمیت دینے کے لیے وہ ذہنی طور پر بالکل تیار نہ تھے۔[۲۵]

مرد اور عورت کے لیے معاشرے میں الگ الگ معیارات طے کر دیے گئے ہیں۔ اگر کوئی عورت ان معاملات پر سوال اٹھاتی ہے۔ انہیں للکارتی ہے تو اسے "بری عورت" کا نام دے دیا جاتا ہے مگر کشور ناہید جیسی شاعرہ ڈر کر یا جھجک کر خاموش نہیں ہوتی بلکہ برابر سوال اٹھاتی رہتی ہے۔

سانپ کینچلی

ہمارے مُلک میں پرندوں کو پیار کرتے دکھانے کی اجازت ہے
ہمارے ملک میں انسانوں کو پیار کرنے اور بیار کرتے دکھانے
کی اجازت نہیں۔
وہ شاید اسی لیے شادی کرتے ہیں
ناخنوں کی پوروں تک دہکتے خون
اور آنکھوں کی لوؤں تک پھیلے جذبوں کو
شادی کا نام دیتے ہوئے
میری انگلی میں پھانس بہت چبھ رہی ہے
مجھے آسمان کا رنگ آنکھوں میں دیکھنے کی تمنا ہے

مجھے گلاب کا رنگ ہونٹ بنتے دیکھنے کی آرزو ہے

مجھے موج موج بدن کی بے چینیوں سے

مغلوب ہونے کی وحشت دیوانہ کیے ہوئے ہے

مگر ہمارے ملک میں انسانوں کو پیار کرنے اور پیار کرتے دکھانے

کی اجازت نہیں

اس لیے تو آستین سے ناک صاف کرتے بچے بھی

نالی پہ بیٹھی لڑکی کو دیکھ کر باؤلوں کی طرح ہنستے ہیں

خواب دیکھتے ہوئے لڑکیاں ڈر جاتی ہیں

اور چیخ مار کر اُٹھ بیٹھتی ہیں

اور لڑکے شیطان کو کنکر مار مار کر بے حال ہو جاتے ہیں

ہمارے ملک میں بے شرمی کی ممانعت ہے

اس لیے ہمارے ملک میں انسانوں کو پیار کرتے دکھانے کی اجازت نہیں[۲۶]

فروغ ایک ایسی فیمنسٹ ہے جو عورتوں کی برابری کی بات کرتی ہے اس کی نظر میں عورت کی پسماندگی اور پستی کی سب سے بڑی وجہ "مرد" ہے کیونکہ مرد نے ہمیشہ عورت کو کمتر سمجھا۔ فروغ عورتوں کو کہتی ہے کہ اپنی جگہ سے اُٹھ اور اپنے حق کا مطالبہ کر! اے بہن تیری خاموشی کی وجہ کیا ہے؟۔ فروغ کے اشعار عورتوں کی فطری ضرورت اور حقیقی احساسات کے تاریخی جوابات ہیں۔ ان کی شاعری نے ایرانی تاریخ میں پہلی بار عورت کے پامال شدہ احساسات کے بارے میں آواز اُٹھائی ہے۔ ابتدائی طور پر تو خواتین کو بھی اس بات پر یقین نہیں آیا اور وہ تعجب بھری نظروں سے انہیں دیکھتی رہیں۔ یہ خواتین اپنی روایتی تربیت کے

باعث ان نظریات کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھیں فروغ کی باغیانہ سوچ کو معاشرے میں شرف قبولیت تک پہنچنے میں ایک طویل عرصہ لگا۔ فروغ مردوں سے مخاطب ہو کر کہتی ہے۔

دیوار

میں تجھ سے صحرا کے دامن تک بھاگتی ہوں
جہاں میرے پیر سخت زمین پر پڑیں
جہاں میں گھاس کے میدان سے شبنم پی سکوں

میں تجھ سے ایک اجاڑ ساحل کی طرف بھاگتی ہوں
جہاں میں تاریک ابر کے نیچے سنگریزوں پر
سمندر کے طوفان کا رقص دیکھ سکوں

دور غروب آفتاب میں
جنگلی کبوتر کی طرح پر تولوں
دشت میں، کوہسار میں، آسمانوں میں
اور خشک جھاڑیوں میں
مرغان صحرا کے گیت سنوں

میں تجھ سے بھاگ رہی ہوں
کہ اپنی آرزو کے شہر کا دروازہ کھول سکوں
جس میں میرے محل پر
ایک بھاری طلائی قفل پڑا ہے

لیکن تیری آنکھیں اپنی خاموش فریاد سے

میری آنکھوں کی راہ دھندلاتی ہیں

جیسے تیرے رازوں کی ظلمت نے

میرے گرد ایک دیوار کھڑی کر دی ہے

لیکن آخر کار میں

غیر یقینی کے جادو سے چھٹکارا پاؤں گی

خوابوں کے رنگین پھولوں سے خوشبو کی طرح اڑ جاؤں گی

گیسوئے نیم شب میں بس جاؤں گی[۲۷]

کشور ناہید مردوں سے مخاطب ہو کر کہہ رہی ہیں:

<u>سایہ</u>

اگر ہمیں دُنیا کو کچھ نہیں دینا

تو پھر ہم کیوں پیدا ہوئے تھے۔

ہمیں وہ عزت نہیں چاہیے

جو بڑے آدمیوں کے ناموں کو سجاتی ہے

ہمیں تو عورتوں کا وہ ذہن رسا چاہیے

جو دھاگے اور موتیوں کے ملاپ سے

ہماری زمین کا حُسن نکھارتی ہیں[۲۸]

فروغ اور کشور ناہید میں ایک اور قدر مشترکہ یہ ہے کہ دونوں کو ہی ازدواجی زندگی راس نہیں آئی۔ فروغ فرخ زاد کو سولہ سال کی عمر میں خود سے پندرہ برس بڑے ایک دور کے رشتہ دار پرویز شاپور سے عشق ہو گیا اور اس نے ماں باپ سے ضد کر کے شادی کر لی اور شاپور کے ساتھ ایران چلی گئی۔ لیکن آغاز سے ہی ازدواجی زندگی میں مسائل سر اُٹھانے لگے اور ایک بچے کامیار کی پیدائش بھی اس رشتے کو مضبوط نہ بنا سکی وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ فروغ کی ذہنی پختگی میں اضافہ ہوا اور شعر و سخن میں ان کی دلچسپی بڑھتی گئی۔

فروغ کو احساس ہوا کہ ان کا آئیڈیل انہیں نہ مل سکا تھا اور اس غم نے انہیں اندوہ گیں، بے باک اور شوریدہ سَر بنا دیا۔ انہوں نے اپنے جذبات کو الفاظ کی مینا کاری میں دفن نہیں کیا بلکہ اس ہیجانی لاوے کو بے ساختہ اُگل دیا۔ جب فروغ کی بے باک نظمیں اشاعت پذیر ہوئیں تو ایران میں فروغ کے خلاف طعن و تشنیع کا ایک طوفان برپا ہو گیا۔ ایرانی معاشرہ آزاد خیال اور خوش باش ہونے کے ساتھ ساتھ محکم مشرقی بھی ہے۔ یہ بالکل انوکھی بات تھی کہ کوئی شاعرہ تو کیا ایک شاعر بھی اپنے عواطف و احساسات کی بے پردہ تجسیم کرے۔ فروغ کا شوہر شاعری میں عشق کے بے باکانہ اظہار کو برداشت نہ کر سکا۔ وہ لوگوں کے طعنوں سے نالاں ہونے لگا۔ اس کا کہنا تھا:

> میں فروغ کے فن کا قدر دان ہوں لیکن کیا کیا جائے کہ فروغ نہیں جانتی یا جاننا نہیں چاہتی کہ وہ کس معاشرے میں زندگی بسر کر رہی ہے۔ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ ایک ہوس ران عورت ہے جس نے اخلاق کی تمام بیڑیاں توڑ ڈالی ہیں۔"۲۹

شادی کے تین سال بعد فروغ کی طلاق ہو گئی لیکن طلاق کے بعد بھی بہت عرصہ تک وہ اپنے شوہر کی محبت میں مبتلا رہی اتنی زیادہ محبت کہ وہ کپڑوں کی الماری میں بیٹھ کر زار زار روتی رہی۔ شاپور سے علیحدگی کے بعد فروغ کی حالت بہت خراب ہوئی لیکن اس کے باوجود وہ تب بھی کسی کو اجازت نہیں دیتی تھی کہ کوئی شاپور کو بُرا بھلا کہہ سکے۔ اپنی شادی کے ٹوٹنے پر فروغ نے صرف ایک جملے میں تبصرہ کیا۔

> میں نے شوہر کو چھوڑ دیا اور شعر کو اپنا لیا۔[۳۰]

۱۹۵۵ء میں اپنی طلاق کے بعد تہران میں واپس جا کر فروغ نے یہ نظم لکھی۔

بازگشت

تیرے خط اور تلخ شکووں کی وجہ سے

میں تیری یاد میں رات گئے تک سو نہ سکی

اے میری امید کے چراغ، میری ڈھارس کے سہارے

ہر گز اس سے رنجیدہ نہ ہو جو میرے شعروں میں چھپا ہے

شاید مجھ میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ خاموشی سے

اپنے چھوٹے سے دل کی بات چھپا سکوں

بھول جا کہ میرے ترانوں میں کوئی راز ہے

بھول جا اس چھپی بات کو جو میرے شعر نے عیاں کر دی ہے

جب میں اپنے عشق کے ماضی پر نظر ڈالتی ہوں

تو یاد گمشدہ آفتاب کی طرح آتی ہے

ان شعروں نے مجھے کیا دیا

سوائے میرے محبوب کے درد کے

اس درد کو چھپانے کی طاقت

مجھ میں نہیں ہے

جن شعروں نے تجھے بہت دکھ دیا

وہ ایک مصیبت زدہ دل کی فریاد ہیں

میرے پیروں میں پھر سے بیڑیاں ڈال دے

تا کہ فتنہ و فریب سے میں مغلوب نہ ہو جاؤں

تا کہ رنگین جذبوں کے ہاتھ

پھر مجھے بے بس نہ کر دیں۔[۳۱]

(یہ نظم فروغ نے ۱۹۵۵ میں لکھی تھی جب طلاق کے بعد وہ تہران واپس چلی گئی تھی۔)

فروغ نے ازدواجی زندگی کی ناکامی سے بہت کچھ سیکھا اور ایسے نسوانی احساسات کہ زبان دی جن کو سننے کی کسی میں بھی طاقت نہیں تھی۔ گھر کی چار دیواری اس کے لیے قید تنہائی تھی اور اس نے قفس میں رہنا نہیں سیکھا تھا۔ اس کے نزدیک دیواروں اور حدود کا قائل ہونا فطرت کے خلاف ہے۔ اسی لیے تو اس نے جب ایک دفعہ ازدواج کی دیوار توڑ دی تو پھر دوبارہ کبھی اسیر نہ ہوئی۔

حلقہ

ایک لڑکی نے پوچھا ہنس کر:

"رازِ اس حلقہ زریں کا ہے کیا

جس نے انگلی کو مری

اس قدر سخت دبا رکھا ہے

جس کی پیشانی پر

اس قدر تابش و رخشندگی ہے؟"

مرد حیران ہوا اور بولا:

"حلقہ خوش بختی،

حلقہ زندگی ہے"

وقت گزرا

اور ایک دن زنِ افسردہ نے

حلقہ زر پہ نظر پھر ڈالی

اور دیکھے وہ شب و روز جو بے سُود گئے

روئی عورت کہ دریغ!

حلقہ زر میں ہنوز

وہی تابش، وہی رخشندگی ہے

یہ غلامی کا ہے حلقہ، سمجھی

حلقہ بُردگی و بندگی ہے [۳۲]

کشور ناہید اور یوسف کامران نے اپنی مرضی سے اور دونوں کے گھر والوں کی نارضامندی سے شادی کی۔ اپنی ازدواجی زندگی میں کشور نے زندگی کا ہر کھٹا میٹھا ذائقہ چکھ لیا اپنی شادی کا احوال بیان کرتے ہوئے کشور لکھتی ہیں۔

> آدھے سیر لڈوؤں پر بیانے والی کے ساتھ ایک بوری میں کتابیں دوسری بوری میں انعامی کپ تھے۔ تن پہ ایک جوڑا تھا۔ ٹانگے میں بیٹھے ایبٹ روڈ کے ایک گھر پر رکے دونوں ڈرے ہوئے تھے کہ آدھے گھنٹے میں فیصلہ کرنے کے حکم پر ہونے والی شادی کے لیے وہ تیار تھا نہ میں، نہ اس کے گھر والوں کو خبر تھی اور نہ کسی دوست کو یہ تو سید زادے سنے شادی نہ کرنے کے میرے فیصلے کی سزا اس کو بھی مل رہی تھی۔ [۳۳]

شادی کے بعد میاں بیوی کے آپس کے تعلقات میں عموماً عورت کو ہی نیچا دیکھنا پڑتا ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ اس بات کا اظہار کشور نے اپنی نظموں میں نہایت ندرت سے کیا ہے۔ سمیون دی بوار نے کہیں کہا تھا کہ

اکثر دو جسم ایک بننے کے بجائے دو جسم ہی رہے ہیں۔ ان میں سے ایک حاکم ہوتا ہے اور دوسرا محکوم۔ یوسف کامران پر کشور نے ایک نظم لکھی جس سے اس کشمکش کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ جس کا یہ رشتہ شکار تھا۔

نظم یوسف کامران

وہ تو مجرم تھا محبت کا
میں اُسے جانتی تھی
میں تو اُس شخص کے ہر نقص کو پہچانتی تھی
میں اسے چاہتی تھی

وہ شفق رنگ، حیا جس کو کہیں
تھی یہی میری وفا کی تعبیر
وہ بہانہ جسے چشمک سمجھیں
تھی مرے تیرے تعلّق کی نظیر

تُو کہ محبوب مجھے تھا، مجھے معلوم ہے یہ
تو کہ مجرم تھا، مرے پیار
مری چاہت کا
تو کہ دیوانہ مخفی محبت تھا سدا
تجھ کو کیا سوجھی
کہ قدموں کے نشاں الجھا کر

چہرۂ زرد لیے

میری ہتھیلی پہ لگی مہندی کو دُھندلانے لگا

جیل کی گرم سلاخوں سے

مرے بچوّں کو تڑپانے لگا

تو کہ مُجرم تھا محبت کا

زمانے کو خبر کیسے ہوئی!![۳۴]

سوچ ایک لذت ہے لیکن اس وقت آزار بن جاتی ہے جب کسی رشتہ کی پیچیدگیاں انسان کو گھیر لیتی ہیں کشور کے ہاں اس حوالے سے اذیت سہنے اور برداشت کرنے کی کیفیت نمایاں ہے۔

رات آتی ہے

دوبستر

ایک ہی کمرے ایک چھت کے سائے میں

ایک پہ بہتا نیند کا ساگر

ایک پہ بے خوابی کا صحرا

ایک پہ نرم ہوا کے جھونکے

ایک پہ لُو سے گرم تھپیڑے

دوبستر

ایک پہ تکیے کی آغوش کا گہرا بادل

ایک پہ شکنیں، امڈے دریا جیسی

ایک پہ خواب کی دیوالی اور دہکے ہونٹ

ایک پہ آنکھ کی ویرانی اور سوکھے ہونٹ

دوبستر

ایک پہ کروٹ، دریا ملے سمندر میں

ایک پہ کروٹ، نکلے آگ کہ جیسے پتھر میں

دوبستر

بیچ نہ ساحل

اور نہ صحرا

پھر بھی ڈونگا لمبا پینڈا۔[۳۵]

فروغ فرخ زاد ایک ایسی ہستی کا نام ہے جو انتہائی سادہ اور اخلاص سے بھرپور ہے۔ فروغ کے ہاں گناہ کا تصور ایک انوکھے رنگ میں دکھائی دیتا ہے اس کی خواہش فرار، باغیانہ روش اور ہر چیز سے وحشت کی شدید کیفیت نے اسے ایک جداگانہ تشخص عطا کیا ہے۔ فروغ کی ابتدائی شاعری کی اشاعت کے ساتھ ہی چاروں طرف سے اس پر ملامت کے تیر برسنے لگے لیکن فروغ اس تہمت و تنقید سے ڈرنے یا گھبرانے والی ہرگز نہیں تھی۔ اس کے جواب میں اس نے بڑی وضاحت سے کہا۔

> مرد آزادی کے ساتھ اور بڑی صراحت کے ساتھ اپنے عشق اور معشوق کی تعریف کرتے ہیں اور انہوں نے عالمِ خیال میں بزبانِ شعر اس کے ساتھ ہر تمنا کا اظہار کیا ہے۔ لوگ ان چیزوں کو بڑے اطمینان سے پڑھتے ہیں۔ لیکن کسی طرف سے کوئی صدا بلند نہیں ہوئی کہ بچائیو پایہ ہائے اخلاق متزلزل ہو گئے ہیں اور عام لوگوں کا اخلاق خطرے میں ہے۔[۳۶]

فروغ ایسے منافقوں کی دنیا سے بھاگ جانا چاہتی ہے جو اس کا کلام سنتے ہیں تو ان کے دل میں لڈو پھوٹتے ہیں لیکن اس پر ہمیشہ دیوانگی کی تہمت دھرتے ہیں۔

فروغ ایسے نام نہاد زاہدوں سے شدید بیزاری کا اظہار کرتی ہے لوگوں کو فریب دینے کے لیے خدا خدا کرنا اس کے نزدیک ایسا ہی مذموم رویہ ہے۔ وہ کہتی ہے اگر شیخ نے ہم پر بہشت کے دروازے بند کر دیے ہیں تو وہ ضرور کھول دے گا جس نے اپنے لطف و کرم سے غم ہماری سرشت میں لکھ دیا ہے۔ وہ للکار کر کہتی ہے کہ واعظوں کے طعنوں کا طوفان ہمارے ہونٹوں سے مسکراہٹ نہیں دھو سکتا۔ ہم سمندر کے درمیان جہاز کی طرح کھڑے ہیں۔

جواب

ہم پر خدا نے کی ہے تبسم بھری نگاہ
ہر چند ہم نے اُس کی نہ کی اختیار راہ
لیکن فریب و مکر سے مانند زاہداں
چھپ کر خدا کی آنکھ سے کرتے نہیں گناہ

پیشانی اپنی داغِ گنہ سے سیہ سہی
لیکن نمازِ مکر کے داغوں سے ہے رہا
نامِ خدا کبھی بھی نہ لیں، بہتر اس سے ہے
بہرِ فریبِ خلق رٹیں گر "خدا خدا"

کیا غم ہمیں کہ شیخ نے کل شب بصد خوشی
ہم پر درِ بہشت اگر بند کر دیا

وہ کھول دے گا، وہ، کہ بصد لطف اور صفا

غم جس نے اپنی خاک کی طینت میں بھر دیا

طوفانِ طعنہ اپنے تبسم سے تھم گیا

ہم کوہ ہیں، میانۂ دریا نشستہ ہیں

دل میں چھپائے گوہرِ یکتائے راستی

ہم موجِ حادثات میں تنہا نشستہ ہیں

وہ آگ جس کے شعلے ہمارے دلوں میں ہیں

چنگاری اس کی شیخ کے دامن پہ گر گرے

ہم کو، کہ سوختہ ہیں شرارانِ عشق کے،

نام گناہ کارہ و رُسوا کبھی نہ دے

جانے دو گر ہمارے لیئے طعنہ زن ہے خلق

سنتے رہو فسانہ عشقِ مدام ما

"ہر گز نہ میرد آں کہ دلش زندہ شد ز عشق

ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما [۳۷]

ایک تڑپتا ہوا احساس، تجسس، ایک راحت ناپذیر تلاش اور زندگی کو برت کر سمجھنے کا ہیجان انگیز جذبہ فروغ کی رگ رگ میں سمایا ہوا ہے۔ بچپن سے ہی ہر چیز کو چھو کر جان لینے کی تمنا اس کے دل میں ہنگامہ برپا کیے

ہوئے تھی۔ اس کے نزدیک گناہ و ثواب اور خدا کا تصور بھی دوسروں سے الگ اور ممتاز نظر آتا ہے۔ فروغ کی بہن پوران فرخ زاد کا کہنا ہے:

> بچپن میں گرمیوں کے موسم میں ہمیں چھت پر سونے کا بہت شوق تھا ہم اکٹھی سوتی تھیں۔ ہم دونوں کے سر ایک ہی تکیہ پر ہوتے تھے۔ ہماری آنکھوں میں ابھی نہ آنسوؤں کی نمی تھی اور نہ غم کا سوز۔ فروغ کہتی۔ میرا دل چاہتا ہے کہ میرے ہاتھ اتنے لمبے ہو جائیں کہ آسمان تک پہنچ جائیں۔ میں ستارے توڑ لوں اور ان کی مالا بنا کر اپنے گلے میں ڈال لوں اور ستاروں کو توڑ کر دیکھوں کہ ان کے اندر کیا ہے۔ میں کہتی۔ ان کے اوپر ہوا ہے۔ فروغ اپنی موٹی موٹی آنکھوں سے ستاروں کو گھورتی۔ میں کہتی۔۔۔ دادی اماں کہتی ہیں کہ ستاروں سے آگے خدا ہے۔ فروغ کہتی میرا جی چاہتا ہے کہ میں وہاں پہنچ جاؤں اور خدا کو دیکھوں شاید میں کسی دن وہاں پہنچ جاؤں اور خدا کو دیکھ لوں۔[۳۸]

فروغ کی کئی نظمیں اس کی مجنونانہ طرز فکر کی زبردست عکاسی کرتی ہیں۔ کبھی وہ بادلوں، پہاڑوں اور آسمانوں سے دور جا کر خدا کے عرش پر بیٹھ جانا چاہتی ہے اور اس خواہش کا اظہار کرتی ہے کہ اگر میں خدا ہوتی تو ایک رات فرشتوں کو حکم دیتی کہ آبِ کوثر کو بھٹی میں جوش دیں اور جلتی ہوئی مشعل ہاتھ میں لے کر پرہیز گاروں کے ریوڑ کو باہر دھکیل دیں۔ کبھی کہتی کہ میں خدا ہوتی تو اپنی بارگاہ کے خادموں کو حکم دیتی کہ راتوں کی شاخ سے چاند کے زرد پتے کو توڑ دیا جائے۔ میں اپنے خشم آلود پنجے سے جہان کو زیر و زبر کر دیتی۔ ہزاروں سال کی خاموشی کے بعد میں پہاڑوں کو سمندروں کے کھلے منہ میں دھکیل دیتی۔ ستاروں کی زنجیریں توڑ دیتی۔ پُر سکوت جنگلوں کی رگوں میں آگ کا لہو دوڑا دیتی۔

میرا دل باغ کے لیے جلتا ہے

کسی کو پھولوں کی فکر نہیں

کسی کو مچھلیوں کی فکر نہیں

کوئی نہیں چاہتا

باور کرے کہ باغ جو تھا

اب مر رہا ہے

کہ باغ کا دل دھوپ میں متورم ہو گیا ہے

کہ باغ کا ذہن جو تھا

آہستہ آہستہ

سبز یادوں سے تہی ہوتا جا رہا ہے۔

اور باغ کی حس شاید

ایسی مجرد شے تھی کہ

باغ کی تنہائی میں گل گئی ہے

ماں کی پوری زندگی

ایک جائے نماز ہے

وحشتِ دوزخ کی راہداری میں بچھائی ہوئی

ماں ہمیشہ ہر چیز کی تہہ میں

معصیت کے نشان ٹٹولتی رہتی ہے

اور اس فکر میں پڑی رہتی ہے کہ

ایک پودے کے کفر نے

باغیچے کو آلودہ کر دیا ہے

ماں تمام دن دعائیں پڑھتی رہتی ہے

ماں ایک طبعی گناہ گار ہے

اور تمام پھولوں پر پڑھ پڑھ کر پھونکتی ہے

اور تمام مچھلیوں پر پڑھ پڑھ کر پھونکتی ہے

اور اپنے آپ پر بھی پڑھ کر پھونکتی ہے

ماں ظہور کے انتظار میں ہے

اور بخشش کے، جو نازل ہو جائے گی۔[۳۹]

کشور ناہید ایک ایسے عہد کی نمائندہ شاعر ہیں جہاں عورت نے بولنا سیکھ لیا ہے لیکن ان کی کئی نظمیں ہمیں تاریخ کے اس دور کی یاد دلاتی ہیں جب معاشرے میں مادرانہ نظام رائج تھا جہاں ماں کی محبت میں پرورش پانے والی نسلیں اس کی زیر سرپرستی سکون و آرام سے رہتی تھیں۔ جہاں نہ تو نجی ملکیت کا تصور تھا اور نہ ہی جنگ و جدل کا نشان تھا۔ اس عہد میں عورت اپنی شخصیت کی صلاحیتوں کے ساتھ معاشرے کی زندگی میں اہم کردار ادا کرتی تھی۔ لیکن جہان معاشرے میں تبدیلی آئی اور پدرانہ نظام رائج ہو گیا تو اس کے ساتھ ہی عورت کی شخصیت کو کچل کر، اسے ذلیل و خوار کر کے معاشرے میں انتہائی نچلا درجہ دے دیا جاتا ہے۔ تب معاشرے میں عورت "گناہ کی علامت" بن کر ابھری جس کی ذات میں سوائے برائی کے کچھ نہیں اس عورت کا فرض ٹھہرا کہ وہ اپنی شخصیت کو ختم کر کے اسے مرد کی ذات میں گم کر دے۔ بچپن سے ہی قیامت سے ڈرانے اور ہر چھوٹی بڑی حرکت پر خدا کی پکڑ کے ڈراوے دے دے کر اسے یہ احساس دلایا جاتا ہے کہ وہ اپنی بخشش کے لیے بھی مرد کی محتاج ہے۔ کشور ناہید لکھتی ہیں۔

عورت تو ہے ہی کم تر درجہ ۔۔۔ ورنہ عورت خدا نہ ہوتی پیمبر ہوتی مرد کے برابر ہوتی ۔۔۔ اس لیے عورت سربراہ مملکت نہیں ہو سکتی ۔۔۔ کون کہہ رہا ہے ۔۔۔ کون فیصلہ صادر کر رہا ہے وہ مذہب کی ڈھال استعمال کرنے کی جرأت، ہر اس دوسرے

دن سے شروع کر دیتے ہیں جب عوام ان کے خلاف فیصلہ سناتے ہیں، کہ وہ مرد
ہیں۔۔۔۔۔وہ خدا ہیں کہ انہوں نے خدا کو ہمیشہ مرد بنا کر پیش کیا ہے۔[۴۰]

مرد کے معاشرے نے عورت کو اس کے بلند و بالا اور عزت کے مقام سے نیچے اتارنے اور اسے ذلیل و رسوا کرنے کی بڑی قیمت ادا کی۔ یہ نظم "ہم گنہگار عورتیں" اس پدرانہ نظام کی عکاسی کرتی ہیں جہاں عورت ایک عرصہ تک خاموش رہی لیکن اب ایک نتیجے پر پہنچ چکی ہے۔

ہم گنہگار عورتیں

یہ ہم گنہگار عورتیں ہیں
جو اہل جبہ کی تمکنت سے نہ رعب کھائیں
نہ جان بیچیں
نہ سر جھکائیں
نہ ہاتھ جوڑیں

یہ ہم گنہگار عورتیں ہیں
کہ جن کے جسموں کی فصل بیچیں جو لوگ
وہ سرفراز ٹھہریں
نیابت امتیاز ٹھہریں
وہ داورِ اہلِ ساز ٹھہریں

یہ ہم گنہگار عورتیں ہیں
کہ سچ کا پرچم اُٹھا کے نکلیں

تو جھوٹ سے شاہراہیں اٹی ملے ہیں

ہر ایک دہلیز پہ سزاؤں کی داستانیں رکھی ملے ہیں

جو بول سکتی تھیں وہ زبانیں کٹی ملے ہیں

یہ ہم گنہگار عورتیں ہیں

کہ اب تعاقب میں رات بھی آئے

تو یہ آنکھیں نہیں بجھیں گی۔

کہ اب جو دیوار گر چکی ہے

اُسے اُٹھانے کی ضد نہ کرنا!

یہ ہم گنہگار عورتیں ہیں

جو اہل جبہ کی تمکنت سے نہ رعب کھائیں

نہ جان بیچیں

نہ سر جھکائیں۔ نہ ہاتھ جوڑیں!"[۴۱]

کشور ناہید کے ہاں گناہ ثواب کا فلسفہ ان کا خود تشکیل کردہ ہے وہ نام نہاد پارساؤں، زاہدوں اور منافقوں کے ڈر سے خاموش نہیں رہتیں اور مذہب کے ٹھیکیداروں سے کوئی غرض نہیں رکھتیں۔

چوبِ خشک اور آگ

مرے عجز کو میرے خدا کو سوا بھلا جانے کون

مرے شوق کو میرے گنہ سے سوا بھلا جانے کون

بھلا جانے کون تجھے اور مجھے

پہنچانے کون تجھے اور مجھے

پہچان کی منزل کوئی نہیں

کوئی سب کچھ جان کے انجانا

کوئی سب کچھ دیکھ کے بیگانہ

جسموں کی ہیئیت تو سب کی ایک سی ہے

اندر تو گھور اندھیرا ہے

ہاں سب کا باہر ایک سا ہے

ذرا جھانکو تو

جسموں کے دریچے دیکھو تو

آنکھوں کی پلکیں ایک سی ہیں

آنکھوں کے ڈورے ایک نہیں

بانہیں تو سب کی ایک سی ہیں

بانہوں کا جُھولنا ایک نہیں

ہاتھوں کی گرمی ایک نہیں

باتوں کی نرمی ایک نہیں

کبھی تم نے تلوے دیکھے ہیں

کُچھ تلوے چاند کے ٹکڑے سے

کُچھ تلوے کنکر ذرّے سے

کُچھ ہاتھ ملائم رُوئی سے

کُچھ ہاتھ دلدّر مٹی سے

یہ دیکھیے کون اُسے پہنچانے کون

مرے شوق کو، میرے گنہ سے سِوا بھلا جانے کون![42]

شاعری کی دنیا میں فروغ ایک روایت شکن اور باغی شاعرہ کے طور پر جانی جاتی ہے۔ وہ ایک ایسی شاعرہ تھی جس نے شاعری کی زبان میں ان موضوعات پر بہت کھل کر بات کی ہے۔ جس سے مرد بھی جھجکتے تھے۔ فروغ کسی جبر سے خوف زدہ دکھائی نہیں دیتی، نہ مردوں سے، نہ تنہائی سے، نہ احساسات کے بے ساختہ اظہار سے اور نہ ہی لوگوں کی لعن طعن سے۔ اس نے اپنے جذبات و احساسات کے اظہار پر پہرے بٹھانے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ شعر کہنا اس کی بنیادی ضرورت کی طرح تھا۔ شعر اس کے لیے اتنا اہم تھا جتنا کہ سانس لینا۔ وہ ایرانی شاعری میں پہلی خاتون ہے جس نے اس قدر تورنا اور برملا اظہار کو اپنایا ہے۔ فروغ کا کہنا ہے۔:

شعر میرا دوست ہے میں اس سے اپنا درد دل بیان کرتی ہوں شاعری ایک کھڑکی ہے اور جب میں اس کھڑکی کی طرف جاتی ہوں تو یہ مجھ پر خود بخود کھل جاتی ہے۔ میں اس کے پاس بیٹھ جاتی ہوں، دیکھتی ہوں، گاتی ہوں، فریاد کرتی ہوں، روتی ہوں، مجھے یقین ہے کہ اس کھڑکی کے پار ایک فضا ہے اور وہاں کوئی میری باتیں سنتا ہے۔ جو ممکن ہے دو سو سال بعد پیدا ہو یا تین سو سال بعد پیدا ہو۔[43]

فروغ نے زندگی میں جو بھی فیصلہ کیا ڈنکے کی چوٹ پر کیا۔ وہ کبھی اپنی ذات، جذبات اور احساسات کے بارے میں شرمندگی کا شکار نہیں ہوئی۔ وہ ہمیشہ دیواروں اور زنجیروں سے وحشت زدہ دکھائی دی۔ آشوبِ عشقِ ناگہاں نے اس کی سب زنجیریں توڑ ڈالیں اور اس کے پاؤں میں ایک چکر رہ گیا۔

<u>گنہ کیا میں نے</u>

گنہ کیا میں نے

گناہِ پُر لذت

اک اس کنار میں جو گرم آتشیں تھی بہت

اور ایسے بازوؤں میں

سلگ رہے تھے جو ظالم تھے، آہنیں تھے بہت

اندھیری خلوت میں

اندھیری اور خموش۔۔۔

نظر ملی اس سے

نگاہ راز سے پُر

عجب نیاز سے پُر

اور ایسی خواہش سے

کے بے قراری سے سینے میں دل مرا لرزا

نہایت آہستہ

میں اس کے کان میں کہنے لگی فسانہ عشق

تیری تمنا ہے جاناں، تیری تمنا ہے

تری تمنا ہے آغوش جاں فزا تیری

تری تمنا ہے۔۔۔

اے مرے دِوانۂ عشق

پیکرِ مدہوش

مرے خدا! مجھے کیا علم کیا کیا میں نے

اندھیری خلوت میں

اندھیری اور خموش[۴۴]

اپنے ہر جائی محبوب سے مخاطب ہو کر اس نے جابجا اپنے جذبات کی پوری تفصیل بیاں کر کے رکھ دی ہے۔ وہ ہر جائی محبوب کی وحشی لگاہوں سے دور کسی دشت کا نظارہ کرنا چاہتی ہے۔ اس پر خواہش کا ایک بھوت طاری ہو جاتا ہے جو اسے ہر وادی میں لیے پھرتا ہے۔ اسے خود معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کس کی کھوج میں نکلی ہے۔ اور اس کے دلِ دیوانہ کا محبوب کون ہے۔

وصل

وہ سیاہ پتلیاں، آہ
وہ میرے سادہ و خلوت نشین صوفی
اس کی آنکھوں کے جذبہ سماع میں
از خود رفتہ تھیں

میں نے دیکھا کہ وہ میرے پورے پیکر پر موجاں ہے
جیسے آگ کی سرخ رخساروں کی آنچ
جیسے پانی کا انعکاس
جیسے بارش کی تشنج میں بادل

جیسے گرم فصلوں کی سانسوں سے آسمان
کراں تا کراں
زندگی کے اُس پار تک
وہ چھایا ہوا تھا

میں نے دیکھا

اس کے ہاتھوں کی روانی میں

میرے وجود کی جسمیت

تحلیل ہو رہی ہے

گھڑی کے پر لگ گئے

پردے کو ہوا اڑا لے گی

میں نے اسے

ایک پیاسے حلقہ میں باندھا تھا

میں نے چاہا کہ کہوں۔۔۔ لیکن

اس کی سیاہ پلکوں کا جھرمٹ

جیسے پردہ ابریشم کے ریشے

تاریکی کے جڑوں سے نکل آئیں

ایک دوسرے میں ہم نے آنسو بہائے تھے

وحدت کے سارے بے اعتبار لمحوں کو

ایک دوسرے میں ہم نے

دیوانہ وار جیا تھا"[۴۵]

فروغ نے جہاں بھی وصل کا ذکر کیا اسے ایک پاکیزہ عمل کی طرح پیش کیا ہے۔ اس نے باریک بینی سے عام لوگوں کی نظروں سے اوجھل اہم نفسیاتی حقائق کی نشان دہی کر ڈالی ہے کہ چاہے جانے کے احساس سے انسانی قلب کی طہارت ہو جاتی ہے۔ اس حوالے سے فہمیدہ ریاض کہتی ہیں۔

> نسائیت فروغ کی شاعری کا جوہر اصالت ہے اس بے مثال شاعرہ نے جس اوجِ کمال، جرات اور سچائی سے نازک نسوانی احساسات کو قلم بند کیا ہے۔ وہ اسے ایک تاریخی حیثیت عطا کر چکا ہے۔ فروغ انتہائی معصومانہ بے تابی کے ساتھ رسوم و قیود کو توڑتے ہوئے اپنی جنسی تجربات کو بیان کرے ہوئے کہہ دیتی ہے کہ "گہنہ کردم، گناہ پُر لذت" جو ایک ایسا طاقت ور نعرہ بغاوت ہے جسے نسوانی اظہار کی صدیوں پر محیط جدو جہد میں سنگ میل قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس کی نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ فروغ بد نام ہو جاتی ہے۔ اسے اس کی مرضی کے خلاف طلاق دے دی جاتی ہے اسے آوارہ قرار دے کر اس کی بچہ بھی ہمیشہ کے لیے اس سے چھین لیا جاتا ہے۔[۴۶]

کشور ناہید وہ پہلی خاتون تھیں جن سے پاکستان میں شاعرات کے ہاں ایک نئے ادبی دور کا آغاز ہوا۔ کشور نے اپنی شاعری میں نسائیت کی مختلف جہات کا بھرپور اظہار کیا ان کی پیشتر نظموں کو عصری نسانی آگہی کا نچوڑ گردانا جاسکتا ہے اس سے پہلے شاعری میں اظہار نسوانیت مروج ادبی چلن کے خلاف تھا اس لیے عورت شاعری میں اپنی سائیکی کا اظہار نہ کر پا رہی تھی۔ لیکن کشور کی شاعری میں پہلی مرتبہ عورت کی شاعری نظر آئی ہے۔ کشور نے اپنی نظموں میں اپنے وجود، اپنی ذات اور سب سے بڑھ کر عورت پن کی بات کی ہے۔ انہوں نے کہیں واضح اور دوٹوک انداز میں بات کی تو کبھی استعاروں اور امیجز کا سہارا لیا۔ کشور نے اپنی نظموں سے اپنے وجود کی یوں توسیع کی کہ وہ عام عورت کی فرسٹریشن ناآسودگی اور پیاس کی علامت بن جاتی ہے۔

ڈاکر سلیم اختر کشور کی کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> کشور ناہید نظموں میں اپنی نسوانیت اور اس کے حوالہ سے پاکستانی عورت کی سائیکی کو Explore کرتی محسوس ہوتی ہے۔ جذباتی گھٹن، جنسی تشنگی اوران سب کے نتیجہ

میں تناؤ سے چٹختے اعصاب نے "بے نام مسافت" کے شعری سفر کے عنوانات مہیا کئے ہیں۔ ہر مجموعہ کشور ناہید کی تخلیقی شخصیت کی نفسی اساس مہیا کرتا ہے۔ چنانچہ اس مجموعہ کی بعض نظموں میں ایسے کار آمد جنسی اشارات اور نفسی تلازمات ملتے ہیں جن سے کشور ناہید کے شعری پیکر کے خدوخال اجاگر ہوتے نظر آتے ہیں۔[۴۷]

کشور ناہید کے ہاں ایک ایسی عورت دکھائی دیتی ہے جو اپنے عورت پن پر شرمندہ یا ملول نہیں ہے وہ قہراً و جبراً اپنے آپ کو قبول نہیں کرتی وہ اپنی جنس کی قدر دان ہے۔ وہ عورت کے منصب اور مسائل کو جسمانی اور روحانی سرشاری کے ساتھ منسلک دیکھتی ہے۔

آتشبازی

تم کو مجھ سے بے انداز ہے پیار اگر تو

میری تنہائی جُھلسا دو

میرے گھر کی دیواروں پر رقم حقارت

آ کے مٹا دو

میری تنہائی ہے

میری آنکھ کی پُتلی

اس کو حُسن بصَیرت بخشو

میری شامِ عروسی سجاؤ

شامِ عروسی

جب تاروں کی جھلمل کایا

مرد کے ہاتھ میں قبضہ قدرت دے کے سُدھارے

جب عورت کی زبان پہ

لاج کے صد آشوب ٹھہر کے سوانگ رچائیں

پھلجھڑیوں کی بارش جاگے

آتش بازی رنگ جمائے

ساری عمر کی آتشبازی۔۔۔۔۔[۴۸]

کشور ناہید فطری طور پر باغیانہ مزاج رکھتی ہیں۔ اسے لیے وہ اپنے موضوعات پر کوئی قدغن برداشت نہیں کرتیں۔ وہ شاہراہِ عام پر کی بجائے اپنا راستہ خود تلاشنے کی حامی ہیں۔ ان کو یقین ہے کہ زندگی کے جو بھی کڑوے، تیکھے، کھٹے، میٹھے تجربات ہیں، وہ ان کو بیان کرنے کی طاقت رکھتی ہیں۔

<u>ترالٹیا شہر بھنبھور</u>

نیند نہیں آتی

بستر کی خواہش بھی آسودگی چاہتی ہے

میں ستارے گنتے گنتے

یہ سوچتی ہوں کہ ستاروں کی گنتی

تو تمہیں گلا گھونٹ کے مار ڈالنے کی گنتی سے کہیں کم ہے۔

تم میں بھی خواہش ہے

مجھ سے خوبصورت بنے رہنے

اور نت نئے ڈیزائنوں کے کپڑوں میں

لپٹے رہنے کی۔

کیلنڈر کی تصویر بدلتی ہے

روز و شب کی تلخی نہیں بدلتی

روز، سہ پہر سے رات

قدموں کی چاپ کی بازیافت

یا ٹیلی فون کی گھنٹی سے

واپس آنے کی تسلی کے حرف کی اُمید میں

بسر ہوئی، منشتر ہوتی رات، اور پھر دن

کریز میں سجے دُھلے دھلائے کپڑوں

کی طرح گزر جاتا ہے

سہہ لہر سے رات

پھر وہی احساس

پھر وہی خواہش،

تالے میں چابی گھومتی ہے

میں کروٹ بدل کر لپٹ جاتی ہوں،

مرتبان میں بند

تتلی کی طرح،

صحرا میں گھومتے

اکیلے چیتے کی طرح،

مگر نیند نہیں آتی۔[۴۹]

کشور ناہید کو بے باکی سے اپنی کیفیات کے اظہار پر مرد کے منافقانہ رویے کا سامنا کرنا پڑا۔ معاشرے کے طے کردہ معیار کے مطابق نہ چلنے اور اپنی من مرضی کی بات کہہ دینے پر ملامتوں کے تیر سہنے پڑے لیکن اس نقطے پر جب ان کا تقابل فروغ فرخ کی شاعری سے کیا جائے تو ہمیں واضح فرق دکھائی دیتا ہے۔

کشور کے ہاں تصورات کی آزادی تو موجود ہے لیکن اظہار میں روایتی اقدار کا پاس بھی نظر آتا ہے۔ ان کی شاعری میں ایک مضطرب عورت کی تصویر موجود ہے۔ لیکن جب وہ اظہار کرتی ہے تو معاشرے کی لگائی گئی قدغنیں اور خاندانی روایات اور اقدار کہیں نہ کہیں اس کے سامنے آ کھڑے ہوتے ہیں۔ وہ جنسی تموج اور خوابناک تصورات کو بیان تو کرتی ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ اس کا دائرہ پھیل کر معاشرے کی ستم رسیدہ عورتوں تک پہنچ جاتا ہے اور پھر یہ احتجاج تیسری دنیا کی تمام خواتین کی آواز بن جاتا ہے۔ اس کے برعکس فروغ فرخ زاد جب ایسی کیفیات اور احساسات کو قلم بند کرنے لگتی ہے۔ تو جذبات کے اظہار میں غیر معمولی بے باکی کا ثبوت دیتی ہے۔ فروغ وفورِ عشق کی دیوانگی میں ہیر کی طرح رانجھا رانجھا کرتی خود رانجھا ہونے کے مقام کو بھی چھو آتی ہے۔ وہ واشگاف انداز میں نام نہاد زاہدوں اور پارساؤں کو للکارتی نظر آتی ہے جو جھوٹی تہذیب اور اخلاق کی بات کرتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں کشور ناہید بات بھی کر رہی ہے اور فرسٹریشن کا اظہار بھی کر رہی ہے لیکن اس اظہار میں کہیں نہ کہیں ایک جھجک اور کھٹک موجود ہے جس کی وجہ سے اسے اشاروں اور کنایوں کا سہارا لینا پڑتا ہے۔

مندرجہ بالا تمام بحث سے با آسانی اس نتیجے پر پہنچا جا سکتا ہے کہ فروغ فرخ زاد اور کشور ناہید اپنے عہد کی نہایت توانا آواز ہیں۔ ان کی تخلیقی سوچ نے شاعری کو ایک نئے رنگ اور آہنگ سے آشنا کیا ہے۔ ان کے ہاں فکر و شعور اور جذبہ و احساس کی نت نئی جہتیں نظر آتی ہیں۔ وہ ایک ترقی پسندانہ سوچ رکھتی ہیں اور ان کی نظر عہدِ حاضر کے تمام مسائل پر بہت گہری اور عمیق ہے۔ ایک اچھے تخلیق کار کی یہی خوبی ہوتی ہے کہ وہ اپنے ماحول اور معاشرے سے موضوعات اٹھائے اور خیال کی سچائی اور فکر کی تازگی کو بروئے کار لا کر جذبے اور احساس کی خوبصورتی سے اُسے مرصع کرے۔ دونوں شاعرات نسائیت کو اپنا جوہر گردانتی ہیں اور جدید عہد کی

ذہنی بیداری کے تقاضوں سے بخوبی آگاہ ہیں۔ اپنے اپنے ملکوں میں جاری ترقی پسندانہ تحریکوں نے ان کے مطالعے اور مشاہدے پر گہرا اثر مرتب کیا۔ ان دونوں کے ہاں شخصی آزادی یا فرد کا تصور ایک سا ہے۔ وہ جب موضوعات منتخب کرتی ہیں تو چاہے وہ ازدواج سے متعلق ہو، معاشرے میں عورت کے عمومی حالات سے ہو یا عورت سے وابستہ گناہ کے تصور سے متعلق ہو، ان کے ہاں گہرا اشتراک پایا جاتا ہے۔ اگر کہیں کوئی اختلاف موجود ہے تو وہ اظہار کے انداز سے متعلق ہے۔ فروغ نے اپنے جذبات اور احساسات کا اظہار انتہائی بے باکانہ اور پُر ہیجان لہجے میں کیا ہے اور راستے میں موجود ہر رکاوٹ کو ڈنکے کی چوٹ پر عبور کیا ہے جبکہ کشور ناہید کے ہاں خیالات اور خواہشات کے اظہار میں روایت اور اقدار کا پاس نظر آتا ہے جو انہیں فروغ جیسا بے باک لہجہ اپنانے سے روک دیتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ مجنوں گورکھ پوری، ادب اور زندگی، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ص۴۸

۲۔ ڈاکٹر محمد ریاض، صدیق شبلی، فارسی ادب کی مختصر ترین تاریخ، بسمہ کتاب گھر، دہلی، ۲۰۰۲ء، ص۱۳۵

۳۔ ڈاکٹر عبدالشکور، مقالات احسن، مرتبین: آفتاب اصغر، معین نظامی، شعبہ فارسی، یونیورسٹی، اورینٹل کالج، لاہور، ۱۹۹۹ء، ص۲۶۴

۴۔ ڈاکٹر عابد سیال، کشور ناہید: ایک لب گویا، لوح، شمارہ ہفتم و ہشتم، جنوری تا جون ۲۰۱۸ء، ص۲۳۹

۵۔ فہمیدہ ریاض، کوئی آرہا ہے، کھلے دریچے سے، وعدہ کتاب گھر، کراچی، ۱۹۹۸ء، ص۱۹۹

۶۔ ڈاکٹر وفا یزداں منش، تہران یونیورسٹی، مکتوب بذریعہ ای میل، تاریخ ۱۸ جون ۲۰۱۸، وقت AM ۰۳:۵۱

۷۔ کشور ناہید، تقریر نمبر ۲۷، دشت قیس میں لیلیٰ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۱ء، ص۵۱۲۔۵۰۹

۸۔ پوران فرخ زاد، بہروز جلالی، جادوی جاودانگی، مروارید پریس، ۱۳۹۴ء، ص۳۵۰

۹۔ کشور ناہید، خود احتسابی، دشت قیس میں لیلیٰ، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۱ء، ص۸۴۰

۱۰۔ انور مسعود، فارسی ادب کے چند گوشے، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۲۰۰۰ء، ص۳۴

۱۱۔ ڈکٹر وفا یزداں منش، تہران یورنیورسٹی، مکتوب بذریعہ ای میل، تاری، ۱۸ جون ۲۰۱۸ء، وقت AM۰۳:۵۱

۱۲۔ ن م راشد، سبز و ہم، جدید فارسی شاعری، مجلس ترقی ادب، کلب روڈ، لاہور، ۱۹۸۷ء، ص۲۸۵

۱۳۔ کشور ناہید، عروسی، دشت قیس میں لیلیٰ، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۱ء، ص۲۶۳

۱۴۔ انور مسعود، فارسی ادب کے چند گوشے، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۲۰۰۰ء، ص۳۶

۱۵۔ کشور ناہید، آخری فیصلہ، دشت قیس میں لیلیٰ، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۱ء، ص۵۵۷

۱۶۔ انور مسعود، فارسی ادب کے چند گوشے، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۲۰۰۰ء، ص۲۴

۱۷۔ بیدار بخت، آرزو، ایران کی باغی شاعرہ، فروغ فرخ زاد کا کلام، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۱۷ء، ص۴۸

۱۸۔ کشور ناہید، تم سے، دشت قیس میں لیلیٰ، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۱ء، ص۵۳۷

۱۹۔ فہمیدہ ریاض، اے ارض پر گہر، کھلے دریچے سے، وعدہ کتاب گھر، کراچی، ۱۹۹۸ء، ص۱۴۹

۲۰۔ ڈاکٹر شریف حسین قاسمی، جدید فارسی شاعری، انڈو پرشین سوسائٹی، دہلی، ۱۹۷۷ء، ص۱۴۵

۲۱۔ کشور ناہید، اپاہج کی گولڈن جوبلی، دشت قیس میں لیلیٰ، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۱ء، ص۱۱۱۴

۲۲۔ ڈاکٹر محسن شیتروی، جادوی جادوانگی، مروارید پریس، ۱۳۹۴ء، ص۳۴۹

۲۳۔ پرتو روہیلہ، عصیاں، فروغ فرخ زاد کی نظمیں، زرنگار بک فاؤنڈیشن، لاہور، ۲۰۱۶ء، ص۵۵

۲۴۔ منیب الرحمن، جدید فارسی شاعری، ادارہ علوم اسلامیہ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ۱۹۵۹ء، ص۱۷

۲۵۔ فہمیدہ ریاض، گلیاں دھوپ دروازے، فیمنیزم اور ہم، وعدہ کتاب گھر، کراچی، ۲۰۱۳ء، ص۱۷۶

۲۶۔ کشور ناہید، سانپ کینچلی، دشت قیس میں لیلیٰ، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۱ء، ص۸۷۹

۲۷۔ بیدار بخت، دیوار، ایران کی باغی شاعرہ، فروغ فرخ زاد کا کلام، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۱۷ء، ص۴۱

۲۸۔ کشور ناہید، سایہ، دشت قیس میں لیلیٰ، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۱ء، ص۴۲۴

۲۹۔ انور مسعود، فارسی ادب کے چند گوشے، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۲۰۰۰ء، ص۲۵

۳۰۔ ایضاً، ص۱۹

۳۱۔ بیدار بخت، بازگشت، ایران کی باغی شاعرہ، فروغ فرخ زاد کا کلام، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۱۷ء، ص۲۸

۳۲۔ فہمیدہ ریاض، حلقہ، کھلے دریچے سے، وعدہ کتاب گھر، کراچی، ۱۹۹۸ء، ص۳۷

۳۳۔ کشور ناہید، بری عورت کی کتھا، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۸ء، ص۶۱

۳۴۔ کشور ناہید، یوسف کامران، دشت قیس میں لیلیٰ، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۱ء، ص۲۷۵

۳۵۔ کشور ناہید، رات آتی ہے، دشت قیس میں لیلیٰ، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۱ء، ص ۵۴۱

۳۶۔ انور مسعود، فارسی ادب کے چند گوشے، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۲۰۰۰ء، ص ۲۵

۳۷۔ فہمیدہ ریاض، جواب، کھلے دریچے سے، وعدہ کتاب گھر، کراچی، ۱۹۹۸ء، ص ۵۶۔۵۵

۳۸۔ انور مسعود، فارسی ادب کے چند گوشے، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۲۰۰۰ء، ص ۳۵۔۳۴

۳۹۔ فہمیدہ ریاض، میر ادل باغ کے لیے جلتا ہے، کھلے دریچے سے، وعدہ کتاب گھر، کراچی، ۱۹۹۸ء، ص ۱۸۹۔۱۸۷

۴۰۔ کشور ناہید، بری عورت کی کتھا، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۱ء، ص ۳۳

۴۱۔ کشور ناہید، ہم گنہگار عورتیں، دشت قیس میں لیلیٰ، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۱ء، ص ۹۷۲

۴۲۔ کشور ناہید، چوب خشک اور آگ، دشت قیس میں لیلیٰ، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۱ء، ص ۵۴۸

۴۳۔ انور مسعود، فارسی ادب کے چند گوشے، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۲۰۰۰ء، ص ۳۷

۴۴۔ فہمیدہ ریاض، گنہ کیا میں نے، کھلے دریچے سے، وعدہ کتاب گھر، کراچی، ۱۹۹۸ء، ص ۳۹

۴۵۔ فہمیدہ ریاض، وصل، کھلے دریچے سے، وعدہ کتاب گھر، کراچی، ۱۹۹۸ء، ص ۱۰۰

۴۶۔ فہمیدہ ریاض، کھلے دریچے سے، وعدہ کتاب گھر، کراچی، ۱۹۹۸ء، ص ۱۹

۴۷۔ ڈاکٹر سلیم اختر، سوتے میں چلتی ہوا سے لڑنے والی شاعرہ، نئے زمانے کی برین، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۰ء، ص ۱۷۰

۴۸۔ کشور ناہید، آتشبازی، دشت قیس میں لیلیٰ، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۱ء، ص ۲۸۳

۴۹۔ کشور ناہید، ترالٹیا شہر بھنبھور، دشت قیس میں لیلیٰ، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۱ء، ص ۴۷۵

باب پنجم

مجموعی جائزہ

انسانی زندگی کے آغاز سے بے شمار تہذیبوں نے جنم لیا اور اپنے عروج پر پہنچ کر زوال کا شکار ہوئیں۔ بہت سی پرانی تہذیبوں کے آثار ہمیں آج بھی دکھائی دیتے ہیں تاریخ کے اس لاکھوں سال کے سفر میں مرد اور عورت دونوں اصناف نے اپنا اپنا کردار نبھایا ہے۔ ایک طویل عرصے تک اس زمین پر مدر سری معاشرہ قائم رہا ہے۔ زرعی انقلاب کے پہلے کے ادوار عورت کے وجود کے مرہون منت نظر آتے ہیں۔ عورت نے زراعت کی ابتداء کی اور زمیں کی ماں کہلائی۔ اس کی اہمیت اس حد تک بڑھ گئی کہ دنیا کی ہر تہذیب میں عورت طاقت کا مظہر اور دیوی کے ادب میں دکھائی دی، خواہ وہ قدیم ترین سومیری تہذیب ہو، مصری ہو، یونانی ہو یا ہندوستانی ہو۔ دنیا کے ہر مذہب اور تہذیب میں ان دیویوں کے بت بنائے گئے ان سے مرادیں مانگی گئیں، چڑھاوے چڑھائے گئے اور ان کے قہر سے بچنے کے لیے قربانیاں دی گئیں صدیوں تک عورت اپنے سنگھاسن پر براجمان رہی مگر یہ پدر سری معاشرے کے قائم ہوتے ہوتے عورت کی اہمیت بتدریج کم ہوتی چلی گئی۔ قدیم مذاہب میں عورت کو ناپاک چڑیل اور راندۂ درگاہ قرار دیا گیا۔ مذہبی کتابوں اور شاستروں میں عورت سے بیزاری اور نفرت کے سبق دیئے گئے۔ عورت کو اس کے مقام سے اس قدر گرا دیا گیا کہ اس کے انسان ہونے پر بھی شک کا اظہار کیا جانے لگا۔ عورت کی زندگی کے تمام اختیارات مردوں نے سنبھال لیے اور اپنی زندگی کے ہر چھوٹے بڑے فیصلے کے لیے مرد پر انحصار کرنا پڑا۔ رفتہ رفتہ ایسا سماجی نظام وجود میں آگیا جس میں عورت محض ملکیت بن کر رہ گئی اس کا وجود ختم ہو گیا اور حیثیت پر سوالیہ نشان لگتا گیا۔ عورت کے ساتھ روا رکھے جانے والے اس غیر انسانی سلوک نے عورت کی ذات اور تشخص کو تباہ کر کے رکھ دیا تھا۔ اس کی اہمیت صرف یہ رہ گئی تھی کہ وہ اولاد پیدا کر کے مرد کی سرپرستی میں دے دے۔ اسے ایک جذبات، احساسات اور عقل و

شعور رکھنے والی ہستی کے بجائے ایک مشین کا درجہ دے دیا گیا۔ تقریباً سولہویں صدی عیسوی تک یورپ میں بھی عورت کو کوئی سماجی مرتبہ نہیں ملا۔

اس وقت کی یورپ میں رہنے والی عورت اور برصغیر میں رہنے والی عورت کم و بیش ایک جیسے حالات میں زندگی بسر کر رہی تھی چند استسنائی مثالیں جیسے برصغیر میں رضیہ سلطانہ، چاند بی بی، رانی جھانسی یا ملکہ نور جہاں اور یورپ میں الزبتھ ٹیلر، کیتھرائن، اور تھریسا وغیرہ موجود ہیں لیکن عام عورت اپنے بنیادی حقوق تک سے محروم تھی بلکہ اس کا شعور بھی نہیں رکھتی تھی۔ عورت کوئی فیصلہ نہیں کر سکتی تھی۔ اپنی مرضی سے شادی نہیں کر سکتی تھی اور اپنی خوشی کے لیے کہیں آجا نہیں سکتی تھی۔

اٹھارویں صدی عیسوی میں یورپ میں علم و شعور کی نئی لہر نے جنم لیا انقلاب فرانس کے بعد تو برابری کے نعرے ہر جگہ سنائی دینے لگے۔ خواتین کو ان کے حقوق کا اندازہ ہوا اور وہ ان کو حاصل کرنے کے لیے کمر بستہ ہو گئیں۔ حقوق نسواں کے لیے کئی تنظیمیں عمل میں لائی گئیں۔ خواتین کو ووٹ کا حق، مساوی اجرت اور دیگر سہولیات دینے کی طرف قدم بڑھایا گیا۔ عورتوں نے اپنے حقوق کے لیے کس قدر جوش و جذبے اور ہمت کا مظاہرہ کیا کہ مردوں کے لیے انہیں پھر سے گھروں میں محدود رکھنا ناممکن ہو گیا۔ رفتہ رفتہ تحریک نے ایک واضح صورت اختیار کی اور "فیمینزم یا تانیثت" کی تحریک کہلائی۔

بنیادی طور پر فیمینزم کی تحریک ایک فلسفۂ حیات اور انداز فکر کا نام ہے۔ یہ ایک ایسی تحریک ہے جو معاشرے میں عورت کے مساوی حقوق کے لیے جدوجہد کرتی ہے۔ اس سے یہ ہر گز مراد نہیں ہوتی کہ خواتین بے لگام اور مادر پدر آزاد معاشرے کا مطالبہ کر رہی ہیں بلکہ خواتین پر ظلم و زیادتی کے خلاف آواز اٹھانا اور انہیں مردوں کے برابر حقوق دینے کی بات کرنا فیمینزم ہے۔ فیمینزم کی تحریک سب سے پہلے فرانس میں ابھر کر سامنے آئی اور کئی تانیثی مفکرین نے اس تحریک کو علمی ادبی اور تنقیدی بلندیوں تک پہنچایا جن میں ژولیا کرسٹیوا، ایلی سیز و، گوئٹے اور سیمون ڈی بوار کے نام نمایاں ہیں۔ خاص طور پر سیمون کی کتاب second sex جو ۱۹۲۹ء میں شائع ہوئی جس نے عورت کے وجود کے متعلق کئی مباحث کو جنم دیا۔ سیمون نے اس بات

کو واضح کیا کہ اگر تذکیر کے کے بغیر تانیثت کا وجود ممکن نہیں تو پھر تذکیر بھی اپنے وجود کے اثبات کے لیے تانیث کا محتاج ہے۔ مگر عام طور پر عورت کو مرد کی نسبت سے پہچانا جاتا ہے مگر مرد کا عورت کی نسبت سے پہچانا جانا بہت تذلیل کا باعث سمجھا جاتا ہے۔ تانیثت کے تصور کو واضح طور پر سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ عورت ایک طویل دورِ ابتلاء سے گزر کر آئی ہے جس میں اس کی ذات ہمیشہ استحصال کا شکار رہی۔ اس سفر میں اس نے بڑی تکلیفیں اٹھائی ہیں اور بڑی کٹھن منزلیں طے کی ہیں۔ ایک انسان ہونے کی حیثیت میں اس کو وہ تمام حقوق حاصل ہونے چاہیں جو انسانیت کے شرف کے مطابق ہیں۔

آزادی کا بیج فطرت نے مرد اور عورت میں یکساں رکھا ہوا ہے۔ اگر آزادی کے فطری اظہار پر پابندی لگادی جائے تو بھی فطرت اپنا راستہ خود بخود نکال لیتی ہے۔ ہندوستانی معاشرے میں عورت ہمیشہ مرد کے دشتِ نگر رہی ہے۔ اسے کبھی بھی اس کا جائز مقام اور اہمیت نہیں دی گئی۔ کبھی مذہب کے نام پر اور کبھی روایتوں کے نام پر ہمیشہ اس کو قربان کیا گیا اور عورت خوشی خوشی قربانی کی سُولی پر چڑھتی رہی کیوں کہ اسے ہمیشہ یہ بتایا گیا کہ مرد کی رضا میں ہی اس کی بچت ہے۔ یہاں تک کہ وہ اپنی بخشش کے لیے بھی مرد کی محتاج ہے۔

دینا بھر میں چلنے والی تحریکوں نے ہندوستانی معاشرے کو بھی متاثر کیا۔ خاص طور پر ترقی پسند تحریک کے بعد معاشرے کے پسے ہوئے اور مجبور طبقوں جن میں عورت بھی شامل تھی کے حقوق کی بات کی گئی۔ اس سے پہلے طبقہ اشرافیہ کے علاوہ عام عورت کی بات نہیں کی گئی تھی۔ خواتین میں علم حاصل کرنے کا شعور بیدار ہوا تو انہیں اپنے حقوق کے پامال ہونے کا ادراک ہوا۔ خواتین کے حق میں لکھنے والے ادیب سامنے آئے۔ شعراء نے ان کے حقوق اجاگر کرنے کے لیے نظمیں کہیں۔ علامہ راشد الخیری اور مولانا حالی جیسے بزرگوں نے خواتین کے لیے آواز بلند کی خود خواتین نے بھی اپنی ذات خیالات کے اظہار کے لیے شعر و ادب کا سہارا لیا۔ خواتین کے لیے رسائل کا اجراء ہوا اور بہت سی لکھنے والیاں سامنے آئیں جن میں نذر سجاد حیدر، بیگم اختر سہروردی، شائستہ اکرام اللہ، ز۔ خ۔ ش، صفیہ شمیم اور رابعہ پنہاں جیسے نام شامل ہیں۔

خواتین نے بہت انقلابی نوعیت کے اشعار کہے اور ادب لکھا۔ اردو نثر میں خواتین میں بہت بڑے نام پیدا ہوئے۔ ڈاکٹر رشید جہاں سے جس سلسلے کا آغاز ہوا وہ عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، خدیجہ مستور، ہاجرہ مسرور، جیلانی بانو، ممتاز شیریں سے لے کر آج کی نئی لکھنے والی ادیباؤں تک جاری ہے۔

شعر کے حوالے سے بہت سی خواتین نے اپنے اشعار میں نسائی شعور کو واضح کیا اور ایک جدید عورت کی آواز بن کر ابھریں۔ ادا جعفری، فہمیدہ ریاض، کشور ناہید، پروین شاکر، شبنم شکیل، شاہین مفتی، عذرا عباس، سارہ شگفتہ اور بے شمار دوسری شاعرات نے شاعری کو ایک جدید رنگ اور آہنگ سے نمایاں کیا۔

دنیا کے ہر ادب کی طرح فارسی ادب میں بھی نسائیت کا اظہار اب ایک حقیقیت بن چکا ہے۔ ایران میں ہر دور میں نسوانی تحریکیں چلتی رہی ہیں اور دنیا بھر میں جاری فیمینیزم کی تحریک نے ایرانی عورت کو بھی اپنا مقام متعین کرنے میں مدد دی ہے۔

ایرانی تاریخ کے تمام ادوار میں خواتین کا کوئی خاص کردار نظر نہیں آتا۔ ایرانی معاشرہ ایک مرد سالاری معاشرہ رہا ہے۔ جس میں خواتین کو کسی قسم کا اختیار حاصل نہیں تھا۔ خواتین کی تعلیم کو معیوب سمجھا جاتا تھا اور عورت کی معاشرے میں اہمیت اس کے مرد کی مرہون منت تھی۔ صدیوں تک ایرانی عورت خاموش رہی اور اپنی قسمت پر شاکر رہی لیکن پہلوی دور تک آتے آتے خواتین میں اپنے مقام اور حقوق کا شعور اجاگر ہونے لگا۔ خواتین اپنی ذات اور وجود کے اظہار کے لیے گھروں سے باہر نکلیں اور مختلف اجلاسوں، اخباروں، رسالوں کے ذریعے اپنا کھویا ہوا تشخص حاصل کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

شعر و ادب کے میدان میں مردوں نے بھی ان کا ساتھ دیا۔ نیما، احمد شاملو اور مہدی اخوان جیسے شاعروں نے خواتین کے حق کی بات کی۔ فارسی شاعری میں کبھی کسی عورت نے عورت کی زبان میں بات نہیں کی تھی۔ فروغ فرخ زاد پہلی ایسی فارسی شاعرہ ہے جس نے عورت کے احساسات، جذبات اور نفسیات کے حولاے سے کھل کر اظہار خیال کیا۔ فروغ نے معاشرے کی کہنہ روایات سے دلیرانہ ٹکر لی اور ڈرے یا

جھجکے بغیر وہ تمام باتیں کہ ڈالیں جن سے معاشرے کے کان آشنا نہیں تھے۔ اس سفر میں اسے ہر طرف سے طعن و تشنیع، دشنام اور ملامتوں کے ایک طوفان کا سامنا کرنا پڑا۔

اردو ادب میں کشور ناہید اور فارسی ادب میں فروغ فرخ زاد ایسی شاعرات ہیں جن کے ہاں فکر کی تازگی، خیال کی سچائی، جذبے اور احساس کی خوب صورتی اور حق و صداقت کی خوشبو پائی جاتی ہے۔ انہوں نے اپنے مطالعے، مشاہدے، احساس و ادراک کے ذریعے وہ میلانات قبول کیے جو جدید حسیت اور عہد کے ذہنی بیداری کے تقاضوں کو پورا کر سکیں۔ کشور ناہید اور فروغ فرخ زاد کی شاعری عرفان ذات اور کربِ ذات کی نمائندہ ہے۔ انہوں نے ان نسائی احساسات کو زبان دی جن پر صدیوں سے پہرے تھے۔ خواتین ان کے بارے میں سوچتی نہیں مگر اظہار خیال نہیں کرتی تھیں۔

کشور ناہید نے جس زمانے میں شعر و ادب کی دنیا میں قدم رکھا وہ پرانی تہذیبوں کے ٹوٹنے اور نئی تہذیبوں کے وجود میں آنے کا عہد تھا۔ خواتین ہر میدان میں مردوں کے دوش بدوش مصروف عمل نظر آنے کی کوشش کر رہی تھیں اور ان قوانین کے خلاف احتجاج کر رہی تھیں جو ان کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ تھے۔ ملک کے سیاسی حالات دِگر گوں تھے۔ اور پے در پے سیاسی صورت حال اور خراب کر دی تھی۔ خواتین کے لیے جو قوانین وضع کئے گئے تھے وہ معاشرے میں خواتین پر بڑھتے ہوئے تشدد کی وجہ بن گئے تھے۔ ان حالات میں کشور نے خواتین کے دستے کی سالار کا کام کیا۔ جو خواتین کے اوپر ظلم و زیادتی کی نشاندہی بھی کرتا اور اس پر احتجاج بھی کرتا۔ کشور کی شاعری کا بیشتر حصہ مزاحمتی شاعری پر مبنی ہے۔ ان کے ہاں المیہ کسی ایک عورت کا نہیں ہے بلکہ تمام معاشرے کی عورتوں کی اجتماعی داستان ہے۔ ان کے سفر کی ابتداء عورت پن کے ساتھ بغاوت سے ہوئی لیکن بعد میں یہ جنگ ذات سے نکل کر پورے نظام کے خلاف ایک بڑی لڑائی میں تبدیل ہو گئی۔ چنانچہ ایک رزمیہ آہنگ شروع سے آخر تک ان کے اسلوب کا حصہ دیا۔ بہت سے ناقدین نے انہیں باغی اور سرکش شاعرہ کا خطاب دیا کہ کشور نے واشگاف لفظوں میں اس کا اعتراف کیا کہ ظلم اور جبر کے

خلاف میرے پاس صرف لفظ تھے جو میں نے رقم کئے، صرف شاعری تھی جس کے ذریعے میں نے عورت کے احساسات کی نمائندگی کی۔

فروغ فرخ زاد ایران کی پہلی ایسی شاعرہ ہیں جس نے ایرانی عورت کے درد کو محسوس کیا اور معاشرے پر مرد سالاری کے چھائے ہوئے بادلوں کو ہٹانے کی کوشش کی۔ ایرانی معاشرے میں عورت ہمیشہ درجہ دوم کی قیدی سمجھی جاتی رہی اور صدیوں تک مرد کی زیر نگرانی خاموشی سے اپنے حقوق کو پامال ہوتے دیکھتی رہی فروغ ایسی تمام عورتوں کی آواز بنی اور اس نے عورتوں کے طور پر ظلم و ستم اور ناانصافی کے خلاف شدید لہجے میں احتجاج کیا فروغ نے اپنی شاعری میں جس درد و تکلیف کا اظہار کیا وہ پوری انسانیت کا درد ہے۔ فروغ کی تمام شاعری انسانیت کی امید کا روزن ہے۔ اور وہ ایک ایسی ہستی نظر آتی ہے جو احساس و فکر کی بلندیوں سے دنیا کو دیکھ رہی ہے۔ کشور ناہید اور فروغ فرخ زاد دونوں شاعرات نے دنیا بھر میں جلدی آزادی اظہار کی تحریکوں کا اثر قبول کیا۔ ان کے ہاں سیاسی و معاشرتی مسائل کے ساتھ ساتھ نفسیاتی و جنسی کیفیات کا اظہار بھی نمایاں ہے۔

فروغ فرخ زاد نے اپنی شاعری کے ذریعے ایسے موضوعات پر بات کی جو معاشرے کے کانوں کے لیے ناآشنا تھے۔ فروغ فرخ زاد نے ایک ایسے معاشرے میں جنم لیا جو مرد سالاری کہلاتا تھا۔ مردوں کی اجارہ داری کے آگے عورت کے جذبات، احساسات اور نفسیاتی مسائل کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ عورت کو ایک مشین کا درجہ دے کر ہر حال میں اس سے تابعداری کی توقع رکھی جاتی تھی۔ فروغ فرخ زاد نے پہلی بار انتہائی بے باکانہ لہجے میں منفی ہیجان کے تلاطم کو اشعار میں انڈیل دیا۔ اس نے اپنے جذبات کو الفاظ کی میناکاری میں دفن نہیں کیا بلکہ صدیوں سے منجمد اس لاوے کو بہنے کے لیے راستہ دے دیا۔ فروغ فرخ زاد کو منافقت سے نفرت ہے وہ نام نہاد زاہدوں اور پارساؤں سے کوسوں دور بھاگتی ہے۔ اپنے حقیقی باغی احساسات کے اظہار میں اسے کوئی جھجک نہیں ہے۔ اُسے دیواروں اور زنجیروں سے وحشت محسوس ہوتی ہے۔ گھر کی چار دیواری اس کے لیے قید تنہائی کے مترادف ہے اس کے نزدیک دیواروں اور حدود کا قائل ہونا فطرت کے خلاف ہے اس

لیے جب اس نے ازدواج کی دیوار توڑ دی تو پھر کبھی اسیر نہ ہوئی۔ وہ سمجھتی ہے کہ اس دنیا کو جہاں تک دیکھو تو دیوار ہی دیوار ہے، خوف ہے، نفرت ہے۔ دھوپ کی راشن بندی ہے، کھل کر سانس لینے کے لیے کوئی روزن میسر نہیں ہے۔ وہ اس دنیا سے دور کسی دشت کا نظارہ کرنا چاہتی ہے۔ فطرت کی خوشبوؤں، بے کنار وادیوں، حسین تنہائیوں اور پہنائیوں میں گم ہو جانا چاہتی ہے۔

خواہش فرار، باغیانہ روش اور ہر چیز سے وحشت کی شدید کیفیت کے ہیجانی اظہار نے فروغ کو معاشرے کے دشنام اور طعن و تشنیع کا مرکز بنا دیا۔ اسے ہر طرف سے ملامتوں کے تیر سہنے پڑے اس کے شوہر نے ان طعنوں سے نالاں ہو کر اسے چھوڑ دیا۔ اس کا بچہ اس سے چھین گیا اور ایک طویل عرصہ تک فروغ کو شعر و ادب کی دنیا میں اس کا جائز مقام نہیں دیا گیا۔

فروغ فرخ زاد نے شعر کو اپنے لیے کھڑکی کا نام دیا جو اس پر خود بخود کھل جاتی ہے۔ وہ اس کے پاس بیٹھ کر گاتی، روتی اور فریاد کرتی ہے۔ زندگی کا ہر مظہر اسے عزیز ہے اور فطرت سے دوری اس کے لیے موت ہے۔ اس کا گناہ و ثواب کا فلسفہ بھی عام لوگوں سے ہٹ کر ہے۔ وہ خدا سے بات کرنا چاہتی ہے اسے شیطان پر بھی رحم آتا ہے کہ اگر وہ شیطان ہے تو اس میں اس کا کیا قصور ہے۔ وہ اس خواہش کا اظہار کرتی ہے کہ اگر میں خدا ہوتی تو ایک رات فرشتوں کو حکم دیتی کہ آبِ کوثر کو دوزخ کی بھٹی میں جوش دیں اور جلتی ہوئی مشعل ہاتھ میں لے کر بہشتِ تر دامن کے سبزہ زاروں سے پرہیز گاروں کے ریوڑ کو باہر دھکیل دیں۔ ایک تڑپتا ہوا احساس، ایک تجسس، ہر چیز کو دیکھ کر جان لینے کی خواہش کا جذبہ فروغ فرخ زاد کی رگ رگ میں سمایا ہوا ہے۔

کشور ناہید جب عورت کی نفسیات و جذبات کو زبان دیتی ہیں تو ان نسائی احساسات اور تصورات کا اظہار کرتی ہیں جن پر صدیوں تک پہرے رہے۔ عورت کے احساسات اور نفسیات کے اظہار اور جنس کی طرف اس کے رویے کو ماحول کی گھٹن، جبر اور قدغنوں نے کبھی بھی کھل کر سامنے نہیں آنے دیا۔ عورت کے لیے معاشرے میں آزاد اور خود مختار فرد کے طور پر اپنی انفرادیت، تشخص اور وجود کا اظہار آسان نہیں ہے۔ اگر کبھی اس نے ان موضوعات پر خامہ فرسائی کی کوشش کی تو اس پر انگلیاں اٹھیں۔ ہمیشہ یہ باور کیا جاتا

رہا کہ جسمانی مسائل اور نفسیاتی الجھنیں تو صرف مغرب کی آزاد، خود مختار اور اخلاق باختہ عورت کے مسائل ہیں۔ ہماری عورتیں تو شرم وحیا کی پتلی ہیں۔ لہذا ان کا تو کسی قسم کا کوئی مسئلہ ہو ہی نہیں سکتا۔ "ہم بہو بیٹیاں یہ کیا جانیں" کے مصداق عورت کے منہ سے عورت پن کی بات یا اپنی نسوانیت کے اظہار کو ہمیشہ معیوب گردانا جاتا رہا۔

کشور ناہید نے تخلیقی سطح پر اپنی ذات، وجود، شخصیت، جسم، اعصاب سب تقاضوں کا بہترین ابلاغ کیا۔ وہ اپنے غم دکھ، کرب، اداس، یاس، پریشانی اور محرومی میں اپنے قاری کو بھی شریک کر رہی ہیں۔ ان کی شاعری میں ایک ایسی عورت دکھائی دیتی ہے جو روایت کے مطابق نہ تو اپنے جسم پر شرمندہ ہے اور نہ ہی اسے گناہ کا مسکن سمجھتی ہے۔ وہ اپنے وجود سے مطمئن اور سرشار ہے اور چاہتی ہے کہ دوسرے بھی اس کے وجود کو تسلیم کر کے اس کی توقیر کریں۔

کشور کی شاعری میں ایک مضطرب عورت کی تصویر موجود ہے جس کے اندر غصے کا لاوا کھول رہا ہے۔ اس میں خود سپردگی بھی موجود ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ ایک ایسی انسانی انا بھی ہے جو عورت کو باندی یا چرنوں کی داسی کی بجائے ایک خود مختار انسان کے طور پر دیکھتی ہے۔ جنسی تموج اور خوابناک تصور اس کے پسندیدہ رہے ہیں مگر ان کے ساتھ ہی وہ ٹھہراؤ کی قائل بھی نظر آتی ہے۔ کشور ناہید کی شاعری میں عورت ہونے کا احساس بہت شدید ہے عورت ہونے کی حیثیت میں ان کے سامنے پورا ماضی ہے جس میں عورت کو کچلا گیا، دبایا گیا یا کمزور بنا کر رکھا گیا۔ اس کی دلکشی حسن، عنائی اور خوبصورتی کو مرد نے بے اثر کر کے محض ایک شے میں تبدیل کر دیا۔ اس کی حیثیت معاشرے میں نجی ملکیت کی سی ہو گئی جسے حقیقی اور ابدی تصور کر طرح پیش کیا گیا۔ مگر کشور اس تصور کو رد کرتی ہیں۔ وہ دو محاذوں پر لڑتی دکھائی دیتی ہیں جہاں ایک طرف تو معاشرے میں استحصال کرنے والے طبقات میں اور دوسری طرف وہ مرد جو بلاوجہ کی مردانہ برتری کے تکبر کے شکار ہیں۔ اس کی شاعری مرد کو آئینہ دکھانے کا کام بھی کرتی ہے۔ جہاں مرد عورت کو ایک پہیلی قرار دے کر اس کے بدن، اس کے اعصاب، حسیات اور نسوانیت کے تقاضوں سے صرفِ نظر کرتے چلے آرہے

تھے۔ وہ تخلیقی سطح پر مرد سے مسابقت کر رہی ہے اور "وجودِ زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ" کے روحانی تصور کے بر عکس اپنی ذات کے کرب، وجود کے دکھ، جسم کی تشنگی کے تذکرہ کے ساتھ ساتھ عورت کی سائیکی کی ترجمانی بھی کر رہی ہیں۔

فروغ فرخ زاد اور کشور ناہید دونوں کے ہاں شخصی آزادی کا تصور نمایاں نظر آتا ہے۔ دنیا بھر میں جاری ترقی پسندی اور مساوات اور برابری پر مبنی تحریکوں سے دونوں شاعرات نے اثرات قبول کیے ان کی ہاں فرد اہم ہے۔ وہ فرد کو صنف سے بڑھ آگے بڑھ کر دیکھنے کی قائل ہیں۔ انسان کو محض اس لیے الگ الگ خانوں میں بانٹ دینا کہ وہ بظاہر ایک دوسرے سے مختلف وجود رکھتے ہیں ان کے نزدیک غیر فطری ہے۔ کوئی انسان کسی دوسرے سے صرف اس لیے برتر اور معتبر نہیں ہو سکتا کہ اتفاق سے وہ مرد کے روپ میں جنم لے چکا ہے۔ وہ مردانہ بالادستی کو رد کرتی ہیں۔ آج کی عورت ایک باشعور عورت ہے۔ اس نے چاردیواری سے نکل کر زندگی سے آنکھیں چار کی ہیں، سیاسی اور اقتصادی مسائل سے بھی واقف ہے اور سماجی اور طبقاتی شعور بھی رکھتی ہے۔ وہ چاروں طرف پھیلی ہوئی زباں بندی کو دیکھتی ہے تو اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو جاتا ہے اور اس کی سرگوشی ایک دلخراش چیخ میں بدلنے لگتی ہے۔

یہ شاعرات صدیوں سے معاشرے میں رائج ان روایتی تصورات کو چیلنج کرتی ہیں جن کی رُو سے انہیں زندگی کے معاملات خود سے وابستہ کسی مرد کے پاس رہن رکھنے پڑتے ہیں۔ شادی سے قبل باپ اور بھائی اور بعد میں شوہر یا بیٹے کے زیر سایہ سماجی مقام، معاشی آسودگی اور جذباتی تحفظ جیسے خوش رنگ انعامات عورت کے لیے مقصد حیات کا درجہ پاتے ہیں۔ جہاں ازدواجی حیثیت معاشرے میں عورت کا مقام متعین کرتی ہے۔ طلاق شدہ یا بیوہ عورت لوگوں کی ملامت اور اٹھی ہوئی انگلیوں کا نشانہ بنی رہتی ہے۔ اور اسے اپنے کردار اور عمل کی سچائی کے لیے بھی انہی لوگوں کی گواہی درکار ہوتی ہے جو پرہیز گاری کے عمامے کے نیچے کھوٹی نیت اور متعفن سوچ کے حامل ہوتے ہیں۔

فروغ فرخ زاداور کشور ناہید ایسی شاعرات ہیں جنہیں بجاطور پر فیمینسٹ قرار دیا جاسکتا ہے۔ فیمینزم کا بنیادی مقصد معاشرے میں عورت کی مساوی حیثیت سے عبارت ہے۔ انسانیت اور نسائیت لازم وملزوم ہیں۔ عورت کی انسانی حیثیت کی تکمیل میں رکاوٹ ڈالنے والی روایتوں کی سمجھنا اور ان کے خلاف عملی قدم اٹھانا ہی نسائیت، Feminism ہے۔ اس طرح نسائی تصور دراصل انسانی تصور ہے۔ اور چونکہ عورت کی انسانی حیثیت سے انکار ممکن نہیں اس لیے نسائی تصور کے بغیر انسانی تصور ممکن نہیں۔

فروغ فرخ زاداور کشور ناہید اس امر سے بخوبی آگاہ ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ان کی نظر نہ صرف معاشرے میں عورت کے ساتھ روا رکھے جانے والے ظلم وستم اور ناانصافی پر رہتی ہے بلکہ وہ عورت کے ذہنی وجذباتی احساسات اور نفسیات کو بھی اپنا موضوع سخن بناتی ہیں۔ وہ ایک ایسی عورت کا تصور پیش کرتی ہیں جو اپنی داخلی کیفیات کے اظہار میں ہر رکاوٹ کو عبور کرتے ہوئے عورت کو اس کے اصلی مقام پر دیکھنے کی خواہاں ہے۔

ان کی شاعری نے عورت کو زندگی گزارنے کا ایک نیا ولولہ اور امنگ دی ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعے زنانہ پن یا نسوانیت کو مردانہ ذہنیت کے زیر سایہ تحفظ فراہم کیا اور اسے ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ وہ خواتین میں سوچ اور آگاہی کی صلاحیت پیدا کرتی ہیں۔ ان کی عورت نہ صرف اپنے حقوق کو پہچانتی ہے بلکہ اس کو حاصل کرنے کے فن اور گُر سے بھی واقف ہے۔ دونوں شاعرات کو بجاطور پر خواتین کے دستے کی سالار کا مقام دیا جاسکتا ہے۔

نتائج

دو ادبی شخصیات یا فن پاروں کے درمیان تقابلی جائزے کا سب سے اہم مقصد ان کی قدر معیار کا تعین کرنا ہوتا ہے۔ اس تعین کے لیے پہلے ایک بنیاد مقرر کی جاتی ہے۔ تقابل کے عمومی طریقہ کار کی پیروی کرتے ہوئے ادبی شخصیات کے عمومی مزاج اور زیر نظر اصناف کے مجموعی تاثر کو سامنے رکھا جاتا ہے۔ شاعری کے حوالے سے تقابل کرتے ہوئے تاریخ اور جدید ترین رجحانات کے معیار کا تعین بھی کیا جاتا ہے۔

فروغ فرخ زاد ایرانی شاعری کی تاریخ میں پہلی توانا اور بے باک آواز ہیں جنہوں نے عورت کی زبان پر صدیوں سے لگے تالوں کو توڑ دیا اور اس کے ساتھ روا رکھی جانے والی ظلم و زیادتی اور ناانصافی پر شدید اللحن ہو کر احتجاج کیا فروغ کی عصر حاضر کے جدید مسائل پر گہری نظر ہے۔ اور وہ ایک گہرے تانیثی شعور کی حامل شاعرہ ہیں۔ بانوانِ ایران کی تاریخ میں وہ ایک نئے طبقے کی موسس نظر آتی ہیں۔ عورت کے جذبات ، احساسات اور نفسیات کے بے باکانہ اظہار کو انہوں نے جس طرح زبان دی وہ ان کی شخصیت کا خاصہ نظر آتا ہے۔ ان کے ہاں عورت کے جذبے کی پکار بہت نمایاں اور بلند آہنگی کے ساتھ سنائی دیتی ہے۔

کشور ناہید ایک گہرے عصری شعور کی حامل شاعرہ ہیں جن کی اپنے عہد کے سیاسی و سماجی مسائل پر گہری نظر ہے۔ معاشرے میں عورت کے استحصال اور اس پر عائد کی جانے والی ناروا پابندیوں کے حوالے سے انہوں نے ایک ایسی فضا مرتب کی ہے جس میں عورت سراپا احتجاج بن کر ابھری ہے۔ وہ اپنے موضوعات، احساس، لہجے اور مجموعی رویے سے نہ صرف چونکاتی ہیں بلکہ تصویر کے دوسرے رخ سے پردہ بھی اٹھاتی ہیں۔ وہ نسائیت کو اپنا جوہر گردانتی ہیں اور اسے کمزوری کے بجائے طاقت سمجھنے کی خواہاں نظر آتی ہیں۔

فروغ فرخ زاد اور کشور ناہید نے خاص طور پر خواتین کے سیاسی و سماجی اور نفسیاتی و جنسی مسائل کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ تانیثیت کی تحریک کے زیر اثر ایرانی اور پاکستانی معاشرے میں قدامت اور جمود کے خلاف خواتین کے ہاں جو شعور دکھائی دیتا ہے۔ اس کا تعلق خواتین کی نفسیات سے بھی ہے۔ ان شاعرات کے ہاں ہمیں روایت کا تصور اور ایک نئے طرز احساس کا امتزاج ملتا ہے۔

مشرقی عورت کے تانیثی شعور کی تفہیم کے لیے ان شاعرات کی شاعری کا تجزیہ ان کے نسائی تصور کو واضح کرنے میں معاون ثابت ہوا ہے۔ ان شاعرات نے اپنی تصنیفات میں خواتین کے حقوق اور مسائل کو واضح طور پر اٹھایا ہے اور نسائی زاویۂ نظر سے اس کا اظہار کیا ہے۔

فرد کی آزادی اور ذاتی تشخص کا تصور ان کے ہاں نمایاں دکھائی دیتا ہے۔ یہ شاعرات مردانہ بالادستی کے تصور کو رد کرتی ہیں اور معاشرے میں مرد اور عورت کے لیے الگ الگ معیارات رائج کرنے کے خلاف آواز اٹھاتی ہیں۔ عورت ذات کے ساتھ جو تصورات منسوب کر دیئے گئے ہیں اور ازدواجی حیثیت میں عورت کو مفعول کا درجہ دینے کی وجہ سے معاشرے میں جو عدم توازن کی کیفیت نظر آتی ہے اس پر یہ شاعرات سراپا احتجاج ہیں۔

فروغ فرخ زاد اور کشور ناہید میں موضوعات، تصورات، احساسات، اور نفسیات میں گہرا اشتراک پایا جاتا ہے۔ اگر کہیں اختلاف کی کوئی ضرورت موجود ہے تو وہ اظہار کے انداز میں موجود ہے۔ فروغ نے اپنے خیالات کو بلا کم و کاست کھل کر صفحہ قرطاس پر بکھیرا ہے جبکہ کشور ناہید نے اپنے اظہار میں معاشرے کی روایات اور اقدار کو بھی ملحوظِ خاطر رکھا ہے۔ ہم اسے اسلوب اور طریقہء کار کا فرق گردان سکتے ہیں مگر بنیادی طور پر دونوں شاعرات کے ہاں نسائی تصور ایک سا ہے۔

سفارشات

اس تحقیق کے بعد سفارشات کے ضمن میں مندرجہ ذیل نکات ہیں۔

۱۔ مختلف زبانوں کے ادب کے حوالے سے جامعات میں کام کی حوصلہ افزائی کی جائے تا کہ نہ صرف تراجم کی روایت کو فروغ ملے بلکہ شعر و ادب میں مشترکہ نکات کی تلاش کی جائے۔

۲۔ فروغ فرخ زاد اور کشور ناہید کا نثر کے حوالے سے قابلِ قدر کام موجود ہے۔ اس کا جائزہ لیا جائے خاص طور پر فروغ کی فلم اور دیگر تصنیفات کے حوالے سے کام کرنے کی ضرورت ہے۔

۳۔ دونوں شاعرات کی آپ بیتی موجود ہے جس کے جائزے سے اُن کے فکر و نظر کے مزید زاویے سامنے لائے جاسکتے ہیں۔ لہذا سوانحی ادب پر الگ سے خصوصی کام کیا جاسکتا ہے۔

کتابیات

بنیادی ماخذ

بیدار بخت، ایران کی باغی شاعرہ: فروغ فرخ زاد کا کلام، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۱۷ء

پرتو روہیلہ، فروغ فرخ زاد کی نظمیں، زرنگار بک فاؤنڈیشن، لاہور، ۲۰۱۶ء

فہمیدہ ریاض، کھلے دریچے سے، وعدہ کتاب گھر، کراچی، ۱۹۹۸ء

کشور ناہید، خیالی شخص سے مقابلہ، دشتِ قیس میں لیلیٰ، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۱ء

کشور ناہید، سیاہ حاشیے، دشتِ قیس میں لیلیٰ، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۱ء

کشور ناہید، میں پہلے جنم میں رات تھی، دشتِ قیس میں لیلیٰ، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۱ء

کشور ناہید، دشتِ قیس میں لیلیٰ، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۱ء

کشور ناہید، لبِ گویا، دشتِ قیس میں لیلیٰ، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۱ء

کشور ناہید، بے نام مسافت، دشتِ قیس میں لیلیٰ، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۱ء

کشور ناہید، ملامتوں کے درمیان، دشتِ قیس میں لیلیٰ، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۱ء

کشور ناہید، گلیاں، دھوپ، دروازے، دشتِ قیس میں لیلیٰ، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۱ء

کشور ناہید، نظمیں، دشتِ قیس میں لیلیٰ، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۱ء

ثانوی ماخذ

ابنِ حنیف، ہزاروں سال پہلے، مکتبہ کارواں، لاہور، ۱۹۶۰ء

اصغر ندیم سید، افضال احمد، (مرتب)، نئے زمانے کی برہن سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۰ء

افتخار شیروانی (مترجم)، عورت کی محکومیت، فیروز سنز، لاہور، ۱۹۹۳ء

امین احسن اصلاحی، پاکستانی عورت دوراہے پر، مکتبہ جدید پریس، لاہور، ۱۹۷۸ء

انور مسعود، فارسی ادب کے چند گوشے، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۲۰۰۰ء

اے ایل بھاشم، ہندوستانی تہذیب کی داستان، نگارشات، لاہور، ۱۹۹۹ء

بہروز جلالی، جادوی جادو رنگی، مروارید پریس، ۱۳۹۴ء

بہروز مجیدی، ایران شناسی، نگاہ پریس، ۱۳۱۴

تدبیر قرآن، جلد سوم

رضا براہنی، تاریخ مذکر ایران، نگاہ پریس، ۱۲۱۴

زاہدہ حنا، زبان کے زخم، ادارہ استحکام شرکتی ترقی، اسلام آباد، ۲۰۰۳ء

سلیم اختر، ڈاکٹر، پاکستانی شاعرات: تخلیقی خدوخال، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۸ء

سلیم اختر، ڈاکٹر، عورت جنس کے آئینے میں، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۹ء

سوزن بیسنیٹ، ترجمہ توحید احمد، تقابلی ادب: ایک تنقیدی جائزہ، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۵ء

سید امیر علی، روح اسلام، ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، لاہور، بار ہفتم، ۱۹۹۰ء

سید قطب، اسلام کا عدل، اجتماعی، ۱۹۴۵ء

سید ہادی، شاہکار شاعران ایران، زمان پریس، ۱۳۱۳

شبلی نعمانی، الکلام، معارف اعظم گڑھ، ۱۳۵۵ھ

شبنم شکیل، ڈاکٹر سلیم اختر، و دیگر، خواتین کی شاعری میں: عورتوں کے مسائل کی تصویر کشی، وزارت ترقی خواتین، حکومت پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۰۵ء

شریف حسین قاسمی، ڈاکٹر، جدید فارسی شاعری، انڈو پرشین سوسائٹی، دہلی، ۱۹۷۷ء

شرافت حسین سید، عورت، مذہب اور حکومت، نسیم بک ڈپو، لاہور، س ن

عبدالقیوم ندوی، اسلام اور عورت، سویرا آرٹ پریس، لاہور، ۱۹۸۲ء

عقیلہ جاوید، ڈاکٹر، حمادرسول، ڈاکٹر، و دیگر (مرتبین)، آدھی عورت۔ پورا ادب، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۱۷ء

فاطمہ حسن، ڈاکٹر، فیمینزم اور ہم، وعدہ کتاب گھر، کراچی، ۲۰۱۳ء

فہمیدہ ریاض، ادب کی نسائی رد تشکیل، وعدہ کتاب گھر، کراچی، ۲۰۰۶ء

کشور ناہید، عورت مرد کا رشتہ (اخذ و ترجمہ)، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۰ء

کشور ناہید، عورت زبانِ خلق سے زبان حال تک، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۰ء

کشور ناہید، بری عورت کی کتھا، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۸ء

مبارک علی، تاریخ اور عورت، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۱۴ء

مجنوں گورکھپوری، ادب اور زندگی، ایجوکیشنل بک ہائوس، علی گڑھ، ۱۹۶۴ء

محمد ریاض، ڈاکٹر، صدیق شبلی، ڈاکٹر، فارسی ادب کی مختصر ترین تاریخ، بسمہ کتاب گھر، دہلی، ۲۰۰۲ء

محمد قطب، اسلام اور جدید ذہن کے شبہات، البدر پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۱ء

منیب الرحمن، جدید فارسی شاعری، ادارہ علوم (اسلامیہ) مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ۱۹۵۹ء

ناصر حریری، ہنر و ادبیات امروز، کتابسرای بابل، ۱۳۶۱

ن م راشد، جدید فارسی شاعری، مجلس ترقی ادب، کلب روڈ، لاہور، ۱۹۸۷ء

نصرت اللہ دین محمدی، بررسی انتقادی شعر، امروز ایران، جلد اول، نارنج پریس، ۱۳۷۷ء

وارث میر، کیا عورت آدھی ہے، نگارشات لاہور، ۱۹۸۹ء

Afzular Rehman: Role of Muslim Woemn in Society, Search Foundation, London, **1986**

Hanson, J. L: Dictionary of Economics and **39**, Commerce, **5**th Edition, R-Machonld & Evans

Jacob Young, News Week, April **16**, New York, **1984**

رسائل و جرائد

الحمد، ڈاکٹر توصیف تبسم (مدیر)، الحمد اسلام یونیورسٹی (شعبہ اردو)، اسلام آباد، شمارہ نمبر ۷، جنوری تا جون ۲۰۱۷ء

جریان ھای شعری از دہہ چھل تا امروز، ماہنامہ آدینہ، جلد ۲۵، ۱۳۶۷

لوح، ممتاز احمد شیخ (مدیر)، اولڈ راوئنز، سہ ماہی کتابی سلسلہ، شمارہ ہفتم و ہشتم، جنوری تا جون ۲۰۱۸ء

ویب سائٹس:

www.meriam.webster.com/dictionary/comparitive%20literature

www.wikipedia.org>wiki>comp

http://tarikhirani.ir/fa(news/30/bodyview/4368/ot

http://sur.conectas.org/en/womens-rights-feminist-movement

ای میل:

ڈاکٹر وفا یزدان منش، مکتوب بذریعہ ای میل، بتاریخ ۱۸ جون ۲۰۱۸ء، بوقت: ۰۳:۵۱am